www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

March 2011 • No. 412

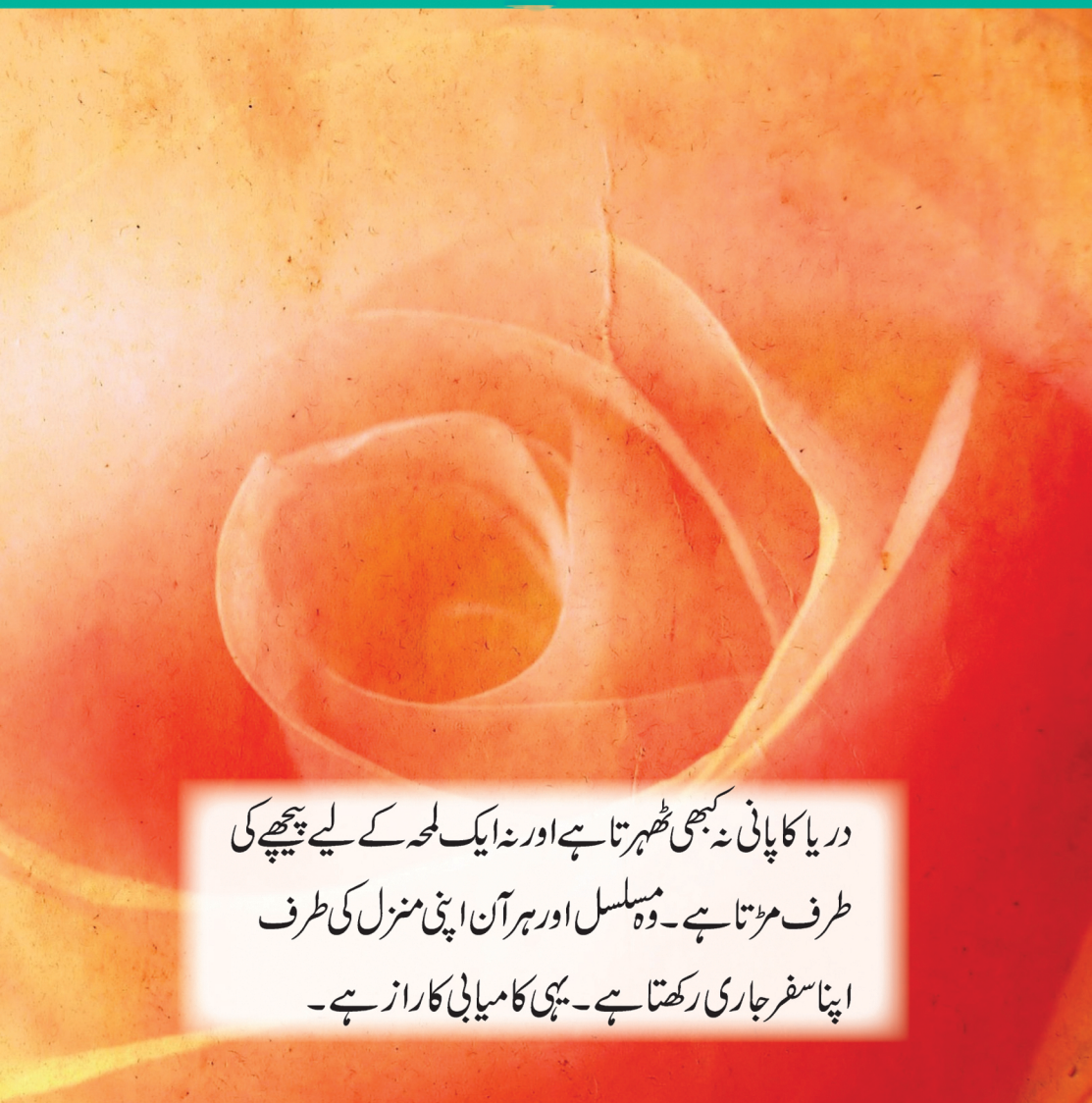

دریا کا پانی نہ کبھی ٹھہرتا ہے اور نہ ایک لمحہ کے لیے پیچھے کی طرف مڑتا ہے۔ وہ مسلسل اور ہر آن اپنی منزل کی طرف اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ یہی کامیابی کا راز ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24355454,46521511
24356666, 41827083
Fax: 45651771
www.goodwordbooks.com
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10
One year Rs. 100
Two years Rs. 200
Three years Rs. 300
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

مارچ 2011

فہرست

اللہ سے محبت	2	مطالباتی سیاست کا نقصان	18
جنت کا استحقاق	3	غیرِ خدا میں جینا	19
ہدایت اور ضلالت	4	رزرویشن کے بغیر	20
سب سے بڑی یقین دہانی	5	ڈی کنڈیشننگ کا طریقہ	21
گروہی ہدایت	6	اتباعِ یہود کا کیس	22
تدبر قرآن	7	حق کی تلاش	26
مذہبی مضاہاۃ، سیاسی مضاہاۃ	8	افرادِ کار کی تیاری	27
قومی مذہب	10	شتمِ رسول کا مسئلہ	28
قرآن فاتحِ عالم	11	تحفظِ نبوت، تحفظِ کارِ نبوت	32
جہاد کیا ہے	12	اعتماد کی اہمیت	33
ابنِ تیمیہ کا موقف	13	کھونے میں پانا	34
احیاءِ اسلام	14	صحیح مشورہ، غلط مشورہ	35
مسلم تاریخ کے تین دور	15	ایک عام کمزوری	36
امتِ محمدی کی ذمے داری	16	سوال و جواب	37
دعوت، دعا	17	خبرنامہ اسلامی مرکز	38

اللہ سے محبت

قرآن کی سورہ البقرہ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والے، اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں (2: 165)۔ اِس آیت میں محبتِ الٰہی سے کیا مراد ہے۔ صوفیا اس کو عشقِ الٰہی کے معنی میں لیتے ہیں۔ علماء کا عام طور پر ماننا یہ ہے کہ محبتِ الٰہی سے مراد اطاعتِ الٰہی ہے۔ مگر اِن دونوں تفسیروں میں محبت کا اصل مفہوم نہیں آتا۔ محبت دراصل کسی کے ساتھ نہایت گہرے قلبی میلان کا نام ہے، یعنی:

Strong affection, deep emotional attachment.

اللہ کے ساتھ یہ گہرا قلبی میلان اُس انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے جو اللہ کے اعلیٰ انعامات کو شعوری طور پر دریافت کرے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا جب کہ اس کا کوئی وجود نہ تھا (19: 9)۔ اللہ نے انسان کو بہترین صورت عطا فرمائی (40: 64)، اللہ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا (**خلق اللہ آدم علی صورتہ**)۔ انسان کو اللہ نے رہنے کے لیے زمین دی، جہاں استثنائی طور پر اس کی ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں، انسان کے لیے اللہ نے جنت کی صورت میں ایک معیاری دنیا (perfect world) بنائی، انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک معیاری جنت بنائی، جہاں اس کو پورا فل فلمینٹ حاصل ہو۔ اللہ نے انسان کو عقل دی جو حدیث کے مطابق، تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اکرم و اشرف چیز ہے (**ما خلق اللہ خلقاً أکرم علیہ من العقل**)، اللہ نے انسانوں کے اندر استثنائی طور پر مودّت پیدا کی جس کی وجہ سے خاندان اور سماج جیسی چیز وجود میں آتی ہے (30: 21)۔ اِن سب پر مزید یہ کہ اللہ نے انسان کو استثنائی طور پر شعور دیا جس سے وہ انعاماتِ الٰہی کو جانے۔ اللہ نے استثنائی طور پر انسان کو احساسِ لذت (sense of pleasure) دیا، جس سے وہ انعامات سے پوری طرح محظوظ ہو سکے۔

اِس طرح کے بے شمار انعامات ہیں جو اللہ نے انسان کو عطا کیے ہیں۔ جب آدمی اِن بے شمار انعاماتِ الٰہی کو سوچتا ہے تو اس کے اندر وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو قرآن میں حبٌّ شدید (2: 165) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

جنت کا استحقاق

قرآن کی سورہ ابراہیم میں ارشاد ہوا ہے: لئن شکرتم لأزیدنکم (14: 7) یعنی اگر تم دنیا میں اللہ کے عطیات پر شکر کروگے تو تم کو آخرت میں خدا کے عطیات دئے جائیں گے۔

حقیقی شکر سب سے بڑا عمل ہے۔ شکر تمام عبادات کا خلاصہ ہے۔ جو آدمی دنیا کی زندگی میں حقیقی معنوں میں شکر گزاری کا ثبوت دے، وہ آخرت میں دوبارہ خدا کی نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔ حقیقی شکر کسی آدمی کو جنت کا مستحق بناتا ہے۔ جنت میں صرف اعلیٰ روحیں داخل کی جائیں گی، اور اعلیٰ روح وہ ہے جو حمد اور شکر کی کیفیات سے بنی ہو۔ اِس اعلیٰ روح کو جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے گا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت والے جب جنت میں داخل کر دئے جائیں گے تو وہ کہیں گے: الحمد لله الذی أذهب عنا الحزَن (34: 35) یعنی اللہ کا شکر ہے جس نے حزن کو ہم سے دور کر دیا۔

دنیا کی زندگی میں ہر آدمی کا ایک لمحۂ حزن یا زمانۂ حزن ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ اس حزن (sorrow) سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ جو آدمی اپنے اِس زمانہ حزن کو اور پھر زمانہ فرحت کو دریافت کرے اور پھر وہ یہ کہہ اٹھے کہ خدایا، تو نے دنیا میں میرے حزن کو دور کر دیا، اِسی طرح تو آخرت میں میرے حزن کو دور کر دے۔ جو آدمی سچے احساس کے ساتھ یہ بات کہے تو یہ بات اس کے لیے ان شاء اللہ جنت میں داخلے کا ٹکٹ بن جائے گی۔ دنیا کی نعمتوں کا اعتراف اس کو آخرت کی نعمتوں کا مستحق بنا دے گا۔

اِس قسم کا قول کوئی سادہ قول نہیں۔ اِس کے لیے گہری شعوری بیداری درکار ہے۔ جو آدمی اپنے اندر اِس قسم کی شعوری بیداری پیدا کرے، اُسی کے دل سے اِس قسم کے کلمات نکلتے ہیں جو اس کے لیے جنت میں داخلے کا استحقاق بن جائیں۔ گہری شعوری بیداری کے بغیر کسی شخص کو یہ توفیق ملنے والی نہیں۔

ہدایت اور ضلالت

قرآن کی سورہ الاعراف میں ارشاد ہوا ہے: وإن یروا سبیلَ الرُّشدِ لا یتخذوہ سبیلاً، وإن یروا سبیل الغيِّ یتخذوہ سبیلاً (7:146) یعنی اُن کا حال یہ ہے کہ اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھیں تو وہ اُس کو نہ اپنائیں گے اور اگر وہ گم راہی کا راستہ دیکھیں تو وہ اس کو اپنالیں گے۔

اِس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، اُس کا تعلق کسی خاص قوم سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق اہلِ کتاب گروہ کی حالتِ زوال سے ہے۔ جب کوئی قوم یا امت اِس حال کو پہنچتی ہے تو اس کے اندر زوال یافتہ نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ اُس کا ذہن وہی بن جاتا ہے جس کا ذکر مذکورہ آیت میں کیا گیا۔

ایسی قوم غیر حقیقت پسندانہ افکار وخیالات میں جینے لگتی ہے۔ اس بنا پر ایسے لوگ اس کے درمیان مقبول ہو جاتے ہیں جو ہائی پروفائل (high profile) میں بولتے ہوں، لو پروفائل (low profile) میں بولنے والا آدمی ان کے درمیان مقبول نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ خود احتسابی (introspection) کو پسند نہیں کرتے، البتہ دوسروں کے خلاف بولنا ان کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔ پرامن کام ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اِس کے برعکس، تشدد اور ٹکراؤ کی باتیں ان کو بہت اپیل کرتی ہیں۔ دوسروں کا خیر خواہ ہونا اُن کے لیے اجنبی بن جاتا ہے۔ وہ اُن لوگوں کی باتوں کو بہت شوق سے سنتے ہیں جو انھیں دوسروں کے ظلم اور سازش کی کہانیاں سنائیں۔ ان کو عمل اور جدوجہد سے رغبت نہیں ہوتی، اِس لیے وہ مطالباتی نعروں کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں، وغیرہ۔

یہ سب زوال یافتہ نفسیات کے مظاہر ہیں۔ جو قوم بھی زوال کی حالت کو پہنچ جائے، اس کا انجام یہی ہوگا، خواہ وہ یہود ہوں یا مسلمان۔ زوال یافتہ نفسیات لوگوں کے اندر بے عملی اور جذباتیت کا مزاج پیدا کر دیتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو رُشد (ہدایت) کی بات اپیل نہیں کرتی، البتہ غيّ (گمراہی) کی بات کی طرف وہ تیزی سے دوڑتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی خدا کی رحمتوں میں حصہ پانے والے نہیں۔ ایسی قوم کی اصلاح کا آغاز صرف یہ ہے کہ اس کے اندر اپنی حالت پر نظر ثانی کا مزاج پیدا کیا جائے۔

سب سے بڑی یقین دہانی

قرآن کی سورہ الحجر میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: **فاصدع بما تؤمر وأعرض عن المشركين. إنا كفيناك المستهزئين** (15:94-95) یعنی جس چیز کا تم کو حکم دیا گیا ہے، اُس کو تم واضح طور پر لوگوں کو سنا دو، اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ ہم تمھاری طرف سے استہزا کرنے والوں کے لیے کافی ہیں۔ قرآن کی یہ آیت پیغمبر کے واسطے سے ہر اُس شخص کو خطاب کر رہی ہے جو پیغمبر کے طریقے پر دعوت الی اللہ کا کام کرے۔ خدا نے نصرت کا جو خصوصی وعدہ اِس آیت میں پیغمبر سے کیا ہے، وہی وعدہ یکساں طور پر ہر داعی کے لیے بھی ہے۔ جو داعی بھی قرآن میں بتائی ہوئی شرطوں کو پورا کرے گا، وہ اِس وعدۂ الٰہی کا مستحق بن جائے گا، استہزا (mockery) کرنے والوں کا استہزا کچھ بھی اس کے دعوتی مشن کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔

قرآن میں بتائی ہوئی یہ شرطیں دو ہیں — ایک، کسی کمی یا بیشی کے بغیر پیغمبرانہ دعوت پر کھڑا ہونا۔ دوسرے، مخالفین کی منفی باتوں سے مکمل طور پر اعراض کرنا۔ داعی اگر یہ دو شرطیں پوری کر دے تو بلاشبہہ وہ مذکورہ نصرتِ الٰہی کا مستحق بن جائے گا۔

نصرت کا یہ معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب حق کو اُس کی خالص صورت میں پیش کیا جائے تو لوگوں کو وہ اُن کی فطرت کے عین مطابق نظر آتا ہے۔ لوگوں کا خود اپنا دل گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ بلاشبہہ سچائی ہے۔ ایسی حالت میں، داعی اگر مخالفین سے نہ الجھے تو گویا کہ وہ مخاطَبین کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کی آواز کو کسی رکاوٹ کے بغیر سنتے رہیں۔ اِس طرح یہ ہوتا ہے کہ داعی جو جواب لوگوں کو دینا چاہتا ہے، وہ زیادہ بہتر طور پر مخاطَبین کی خود اپنی فطرت کی طرف سے اُن کو مل جاتا ہے۔ یہی مطلب ہے اِس کا کہ — اگر تم اعراض کرو تو اللہ تمھاری طرف سے استہزا کرنے والوں کے لیے کافی ہو جائے گا۔ یہ داعی کے لیے اُس کے مشن کے سلسلے میں ایک ایسی یقین دہانی (assurance) ہے جس سے بڑی یقین دہانی بلاشبہہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

گروہی ہدایت

قرآن کی سورہ البقرہ میں ارشاد ہوا ہے: وقالوا کونو هوداً أو نصاریٰ تهتدوا، قل بل ملّة إبراهيم حنيفاً، وما كان من المشركين (2:135) یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ کہو کہ نہیں، بلکہ ابراہیم کا دین (اختیار کرو) جو اللہ کی طرف یکسو تھا، اور وہ شریک کرنے والوں میں نہ تھا۔

قرآن کی اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کوئی امت جب اپنے دورِ زوال (de-generation) میں پہنچتی ہے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ ایسی امت ہدایت (guidance) کو گروہ (community) سے وابستہ کر دیتی ہے، نہ کہ اصولی تعلیمات سے۔ یہود و نصاریٰ کا یہی حال اپنے دورِ زوال میں ہوا۔ انھوں نے گروہ کو دین کے ہم معنیٰ سمجھ لیا۔ ان کا عقیدہ یہ ہو گیا کہ وہ ایک نجات یافتہ گروہ ہیں، ہدایت کا معیار یہ ہے کہ آدمی اُن کے گروہ کے ساتھ وابستہ رہے۔ مذکورہ آیت میں ملتِ ابراہیم سے مراد دین ابراہیم ہے۔ گویا کہ یہاں تقابل گروہی ہدایت اور اصولی ہدایت کے درمیان کیا گیا ہے۔

اِس اصول کا تعلق صرف قدیم امتوں، یہود و نصاریٰ، سے نہیں ہے، بلکہ بعد کی امت مسلم امت، بھی یکساں طور پر اس کی مخاطب ہے۔ مسلم امت اگر شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لے کہ مسلمان اور اسلام دونوں ایک ہیں۔ وہ یہ عقیدہ بنا لے کہ صرف گروہی اعتبار سے جو لوگ مسلم جماعت میں شامل ہیں، وہ اپنے آپ ہدایت پر ہیں اور اُن کے لیے نجات یقینی ہے تو یہ عقیدہ بھی اتنا ہی زیادہ غلط ہوگا جتنا کہ یہودیوں اور مسیحیوں کا عقیدہ۔

خدا کا دین ہمیشہ اصول پر قائم ہوتا ہے، یعنی اللہ سے شدید محبت اور اللہ سے شدید خوف۔ جو لوگ اپنی زندگی میں اِس اصول کو پوری طرح اختیار کریں، وہ خدا کے یہاں ہدایت یاب قرار پائیں گے۔ کسی نسلی جماعت یا کلچرل گروہ سے وابستہ ہونا ہدایت یاب ہونے کا ثبوت نہیں۔ ہدایت کا یہی معیار (criterion) ماضی کے لیے بھی ہے اور ہدایت کا یہی معیار حال کے لیے بھی۔

تدبر قرآن

قرآن کی سورہ ص میں بتایا گیا ہے کہ: **كتاب أنزلناه إليك مبارك ليدبّروا ايٰاته وليتذكر أولو الألباب** (38:29) یعنی یہ قرآن ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمھاری طرف اتاری ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اُس سے نصیحت حاصل کریں۔

اِس آیت میں تدبر سے مراد تفکر ہے۔ تفکر کیا ہے، تفکر دراصل عقل کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو پڑھتے ہوئے اپنی عقل کو کھلا رکھو، کیوں کہ عقلی غور وفکر کے ذریعے ہی کسی کو قرآن سے معنوی نصیحت ملتی ہے، نہ کہ محض لفظی تلاوت سے۔

اِس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جب قرآن کی تلاوت کرے تو اُس وقت وہ اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے اس کی تلاوت کرے۔ اسی طرح جب وہ نماز میں قرآن کا کوئی حصہ پڑھے تو وہاں بھی وہ اپنی عقل وفہم کو کھلا رکھتے ہوئے قرآن کی تلاوت کرے۔

کوئی شخص جب اِس طرح قرآن کی تلاوت کرے گا تو بار بار ایسا ہوگا کہ قرآن کی کوئی آیت یا قرآن کا کوئی لفظ اس کی عقل کو اسٹرائک (strike) کرے گا۔ ایسے موقع پر آدمی کو چاہیے کہ وہ ٹھہر کر اُس پر غور کرے۔ اِس طرح اس کو قرآن سے نصیحت کی غذا ملتی رہے گی۔

مثال کے طور پر قرآن کو پڑھتے ہوئے یہ آیت آپ کے سامنے آئی: **فأثابهم الله بما قالوا جنات تجرى من تحتها الأنهار** (5:85)۔ اِس آیت کو پڑھتے ہوئے آپ کو یہ حدیث یاد آئی: **مَن قال لا إلٰه إلا الله، دخل الجنة (الطبرانی، رقم الحديث: 2447)**۔

اس کے بعد آپ نے سوچا کہ دونوں آیتوں میں مطابقت کیا ہے۔ پھر غور کرنے کے بعد آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ حدیث میں جس ''قول'' کا ذکر آیا ہے، اس کی تشریح قرآن سے ہوتی ہے، یعنی حدیث میں جس قول پر جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اُس سے مراد قولِ معرفت ہے، نہ کہ محض لفظی قول۔ یہی وہ چیز ہے جس کو تدبر اور تفکر (contemplation) کہا گیا ہے۔

مذہبی مضاہاۃ، سیاسی مضاہاۃ

یہود و نصاریٰ اپنے دورِ زوال میں جن برائیوں میں مبتلا ہوئے، اُن میں سے ایک برائی وہ ہے جس کو قرآن میں مُضاہاۃ (9: 30) کہا گیا ہے۔ مضاہاۃ کے لفظی معنی مشابہت (imitation) کے ہیں، یعنی غیر دینی طریقے کو دینی نام دے کر اختیار کر لینا۔ مثلاً غیر دینی لوگوں کے یہاں خدا کی پرستش کے بجائے بت کی پرستش کا رواج ہے، اِس سے متاثر ہو کر اس روش کو اختیار کر لینا، مگر اس کو بزرگوں کی پیروی کا نام دے دینا، وغیرہ۔

مضاہاۃ کی ایک صورت وہ ہے جس کو مذہبی مضاہاۃ (religious imitation) کہا جاسکتا ہے۔ بدعت کے تمام طریقے اِسی مذہبی مضاہاۃ کی فہرست میں شامل ہیں۔ بدعت، مجرد بدعت کا نام نہیں ہے۔ بدعت دراصل یہ ہے کہ غیر دینی طریقے کو دینی نام دے کر اُس کو اختیار کر لیا جائے۔

موجودہ زمانے میں مضاہاۃ کی ایک اور قسم بہت بڑے پیمانے پر ظاہر ہوئی ہے۔ اس کو سیاسی مضاہاۃ (political imitation) کہا جاسکتا ہے، یعنی سیکولر پارٹیوں اور سیکولر تحریکوں کے طریقے کو اسلامی نام دے کر اس کو اسلامی عمل کے طور پر اختیار کر لینا۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے احتجاج (protest) کے طریقے کو بہت بڑے پیمانے پر اختیار کر لیا ہے۔ یہ بلاشبہہ سیاسی بدعت یا سیاسی مضاہاۃ ہے۔ مثلاً اسلامی مسائل کے نام پر احتجاجی بیانات، احتجاجی مظاہرے، احتجاجی کانفرنسیں، احتجاجی ریلی، احتجاجی دھرنا، احتجاجی نعرے، وغیرہ۔

احتجاج (protest) بلاشبہہ سیکولرزم کا طریقہ ہے، وہ اسلام کا طریقہ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مقدس کعبہ کو عملاً بت خانہ بنا دیا گیا تھا، مگر آپ نے اُس پر احتجاج نہیں کیا۔ اِسی طرح تیرہ سالہ مکی دور میں رسول اور اصحابِ رسول پر ہر قسم کے مظالم کئے گئے، لیکن آپ نے اِس پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ دارالندوہ میں آپ کے خلاف بائکاٹ کی تجویز پاس کی گئی، مگر آپ نے اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کیا گیا، لیکن آپ نے اس پر

احتجاج نہیں کیا، وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ احتجاج (protest) اپنے آپ میں سرتاسر ایک غیر اسلامی طریقہ ہے۔ احتجاج کو خوب صورت نام دے کر اس کو اسلامی نہیں بنایا جاسکتا۔ مثلاً پُرامن احتجاج، دینی احتجاج، اپنے حق کے لیے احتجاج، حکمراں کے ظلم کے خلاف احتجاج، پیغمبر کی شان میں گستاخی کے خلاف احتجاج، عبادت خانے کی بے حرمتی کے خلاف احتجاج، اسلام کی توہین کے خلاف احتجاج، وغیرہ۔

اِس مضاہاۃ یا مشابہتِ غیر کی نفسیات کیا ہے۔ اِس کا جواب قرآن کی اِس آیت میں ملتا ہے: **تشابهت قلوبهم** (2:118) یعنی سوچ کی سطح پر مشابہت۔ دورِ زوال میں حاملِ کتاب امتوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اُن کے اندر دینِ خداوندی پر مبنی سوچ ختم ہوجاتی ہے۔ خدائی طرزِ فکر ان کے ذہن میں زندہ تصور کے طور پر باقی رہتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آس پاس کے غیر دینی افکار سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ خدائی ماڈل عملاً اُن کے لیے ایک غیر معلوم چیز بن جاتا ہے۔ وہ غیر خدائی ماڈل کو دینی ٹائٹل دے کر اختیار کر لیتے ہیں۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں مضاہاۃ کی دونوں قسمیں مکمل طور پر آچکی ہیں، مذہبی مضاہاۃ بھی اور سیاسی مضاہاۃ بھی۔ مسلمانوں کے اندر طرح طرح کی جو مبتدعانہ رسمیں ہیں، وہ سب اِس مذہبی مضاہاۃ کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً جنم اشٹمی کی جگہ میلاد النبی، ہنومان چالیسہ کی جگہ قرآن خوانی، وغیرہ۔

موجودہ زمانے کے مسلمان ساری دنیا میں ملی سیاست کے نام سے جو سرگرمیاں جاری کئے ہوئے ہیں، وہ سب کی سب بلا استثنا سیاسی مضاہاۃ کا نتیجہ ہیں۔ ملی سیاست یا اسلامی سیاست کے نام پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے بہت بڑے پیمانے پر غیر اسلام کو اسلامائز کر رکھا ہے۔

یہ نام نہاد اسلامی سیاست اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہودی سیاست ہے۔ اس کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہ دنیا میں ملنے والا ہے اور نہ آخرت میں۔ مسلمانوں کے کرنے کا کام دعوت ہے، نہ کہ سیاست۔ مسلمان جب تک مضاہاۃ کے یہودی طریقے کو چھوڑ کر دعوت کا طریقہ اختیار نہ کریں، اُس وقت تک وہ خدا کی رحمت سے محروم رہیں گے، دعوت الی اللہ کے بغیر ان کو ہرگز خدا کی نصرت ملنے والی نہیں۔

قومی مذہب

یہود نے اپنے دورِ زوال میں جو روش اختیار کی تھی، اس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **من الذین هادُوا یحرّفون الکلم عن مواضعه** (4: 46) یعنی یہود میں سے ایک گروہ (یہودی علماء اور قائدین) کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹا دیتا ہے۔

اس آیت کی تشریح مفسر القرطبی نے اِن الفاظ میں کی ہے: **یتأوّلونه علی غیر تأویله**۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سیاق (context) کو بدل کر کلامِ الٰہی کی تشریح کرتے ہیں۔

اِس معاملے کی ایک مثال اصولی نجات کو گروہی نجات کے ہم معنیٰ بنانا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **وقالوا کونوا هوداً أو نصاریٰ تهتدوا، قل بل ملّةَ إبراهیم حنیفاً** (2: 135) یعنی وہ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت یاب ہوگے۔ کہو، بلکہ ابراہیم کے دین کی پیروی کرو۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کی اصل گمراہی کیا تھی۔ یہود کی اصل گمراہی یہ تھی کہ انھوں نے اصولی دین کو قومی دین کے ہم معنیٰ بنا لیا تھا۔ ایک لفظ میں، اُن کا کیس خدائی مذہب کو ملّی بنانا (communalization of divine religion) تھا۔

یہ دراصل دورِ زوال کا ظاہرہ ہے۔ جب کسی اہلِ کتاب گروہ پر زوال آتا ہے تو اُس کا حال یہی ہوجاتا ہے۔ وہ خدائی مذہب کو اپنی قومی خواہشوں پر ڈھال لیتا ہے۔ وہ خدائی مذہب کی ایسی تاویل کرتا ہے جو اس کے قومی مزاج کے مطابق ہو۔

یہی حال موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا ہوا ہے۔ انھوں نے خود ساختہ تاویل (interpretation) کے ذریعے اصولی نجات کو گروہی نجات کے ہم معنی بنالیا ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا اسلام عملاً قومی اسلام (communalized Islam) بن گیا ہے۔ وہ اسلام کی تعلیمات کو ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں جو اُن کی ملی خواہشوں کے مطابق ہوں۔ اِس قسم کا خود ساختہ مذہب اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہونے والا نہیں، نہ یہودیوں سے اور نہ مسلمانوں سے۔

قرآن فاتحِ عالم

خلیفہ ثانی عمر فاروق کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنّ اللہ یرفع بھذا القرآن أقواما ویضع بہ آخرین (الدارمی، رقم الحدیث: 3365) یعنی اللہ اِس قرآن کے ذریعے ایک قوم کو اٹھاتا ہے اور اُسی کے ذریعے وہ دوسری قوم کو گراتا ہے۔ یہ اصول امتِ مسلمہ کی ابتدائی تاریخ میں پوری طرح ایک واقعہ بن چکا ہے۔ مورخین نے عام طور پر اِس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر فلپ ہٹی (وفات: 1978) نے اپنی کتاب تاریخ عرب (The History of the Arabs) میں تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاری قبائل کے قبولِ اسلام کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ — مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کرلی، جہاں اُن کی تلوار ناکام ہوچکی تھی:

The religion of Muslims has conquered, where their arms had failed.

قرآن ایک آئڈیالوجی کی کتاب (book of ideology) ہے۔ اس کے مقابلے میں، تلوار مادی طاقت کی علامت ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تلوار کے مقابلے میں قرآن زیادہ طاقت ور ہے۔ تلوار کی فتح، مفتوح کے خاتمہ کی قیمت پر ہوتی ہے، جب کہ قرآن آدمی کے دل و دماغ کو مسخر کرکے اس کو آپ کا ساتھی بنا دیتا ہے۔ تلوار کی فتح صرف میدانِ جنگ کی فتح ہے، اور قرآن کی فتح خود انسان کی فتح، اور جب انسان فتح ہوجائے تو گویا سب کچھ فتح ہوگیا۔

قرآن، خدا کا محفوظ ہدایت نامہ ہے۔ قرآن آدمی کی فطرت کو ایڈریس کرتا ہے۔ قرآن آدمی کی تلاش کا جواب ہے۔ قرآن آدمی کو دنیا اور آخرت کی کامیابی کا راز بتاتا ہے۔ مزید یہ کہ قرآن صرف ایک نظریاتی کتاب نہیں، بلکہ اس کی پشت پر ایک واقعاتی تاریخ موجود ہے جو اس کی تسخیری طاقت کی تصدیق کرتی ہے۔ قرآن نظریہ بھی ہے اور تاریخ بھی۔ اِن باتوں نے قرآن کو ابدی طور پر ایک ناقابلِ تسخیر کتاب بنا دیا ہے۔ جو لوگ قرآن کی دعوت کو لے کر اٹھیں، اُن کے لیے کسی اور طاقت کی ضرورت نہیں۔ قرآن اپنے آپ میں اُن کی تمام دعوتی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کافی ہے۔ قرآن فاتحِ انسان بھی ہے اور فاتحِ عالم بھی۔

جہاد کیا ہے

جہاد کیا ہے۔ جہاد کے لفظی معنی کوشش (struggle) کے ہیں۔ اِس میں مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے، یعنی بہت زیادہ کوشش کرنا۔ قرآن اور حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کا لفظ تقریباً اُسی معنی میں استعمال ہوا ہے جس معنی میں آج کل مشن (mission) کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مشن کا مطلب ہے— کسی تعمیری مقصد کے لیے سنجیدہ جدوجہد:

Dedicated effort towards a constructive goal.

قرآن میں اِس سلسلے میں یہ آیت آئی ہے: **وجاهدوا في الله حق جهاده، هو اجتباكم** (22: 78)۔ اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جہاد کا تعلق اُس مخصوص مشن کے لیے ہے جس کے لیے اہل ایمان کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ مشن شہادت علی الناس (22: 78) کا مشن ہے۔ اس آیت میں شہادت سے مراد دعوت ہے، یعنی خدا کے پیدا کئے ہوئے انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچانا۔ یہی دعوت ہے اور یہی دعوتی مشن وہ نشانہ ہے جس کے لیے اہل ایمان کو بھرپور کوشش کرنا چاہیے۔ اپنی زندگی، اپنا وقت، اپنا پیسہ، اپنے وسائل ہر چیز کو اِس مشن میں لگا دینا چاہیے۔

ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: **الجهاد ماضٍ منذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال، لا يبطله جَور جائر ولا عدل عادلٍ** (سنن أبي داؤد، رقم الحديث: 2532)

اِس روایت کے مطابق، جہاد سے مراد ایک ایسا عمل ہے جو عادل حکمراں کے زمانے میں بھی جاری رہے۔ ایسا عمل صرف پُرامن دعوتی مشن ہوسکتا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق، دجال سے جو مقابلہ ہوگا، وہ بھی اسلحہ کے ذریعہ نہیں، بلکہ حجت (argument) کے ذریعہ ہوگا (**إن يخرج وأنا فيكم فأنا حجيجه دونكم**)۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد پرامن دعوتی مشن کا نام ہے۔ دوسری کوئی چیز اس کا صرف اضافی جز (relative part) ہے، نہ کہ حقیقی جز۔

ابنِ تیمیہ کا موقف

موجودہ زمانے کے مسلمان مختلف ملکوں میں مسلّح تحریکیں چلا رہے ہیں۔ یہ تمام تحریکیں غیرحکومتی تنظیموں (NGOs) کے تحت چلائی جارہی ہیں۔ ایسے افراد کو غیر ریاستی ایکٹر (non-state actors) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنی مسلح تحریکوں کے جواز کے لیے ابن تیمیہ کے فتوے کا حوالہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن تیمیہ کے زمانے میں تاتاری جارحیت کا مسئلہ پیدا ہوا تو ابن تیمیہ نے فتویٰ دیا کہ مسلمان اُن کے خلاف لڑیں۔ اِسی طرح ہم اپنے زمانے کی جارح طاقتوں سے لڑ رہے ہیں۔ یہ حوالہ غلط ہے۔ یہ درست ہے کہ ابن تیمیہ (وفات: 728ھ/1328ء) کے زمانے میں تاتاری حملے کا مسئلہ پیدا ہوا۔ تاتاریوں نے بغداد کے آخری خلیفہ المستعصم کو 1258ء میں ہلاک کردیا۔ اِس کے بعد مسلح تاتاری مسلم شہروں میں پھیل گئے اور بڑے پیمانے پر وہاں قتل وغارت گری کرنے لگے۔ یہ ابن تیمیہ کا زمانہ تھا۔ انھوں نے مصروشام کے مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ تاتاری جارحیت کا مقابلہ کرو۔ مگر ابن تیمیہ کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ وہ غیر ریاستی عوام کو تاتاریوں سے لڑنے کا فتویٰ دیں۔ اُس وقت اب بھی شام میں مسلم حکمراں ابن النحاس اور مصر کا حکمراں سلطان محمد بن قلاؤون موجود تھا۔ ابن تیمیہ دونوں مسلم حکمرانوں سے ملے اور دونوں کو تاتاریوں کی جارحیت کے خلاف جنگ کے لیے ابھارا۔ اِسی کے ساتھ انھوں نے مصروشام کی مسجدوں میں تقریریں کرکے مسلم عوام سے کہا تم لوگ اِس دفاعی مہم میں ان مسلم حکمرانوں کا ساتھ دو (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، **البداية و النهاية لابن كثير**، جلد 14)۔

حقیقت یہ ہے کہ جارح کے خلاف مسلح دفاع صرف ریاست کا کام ہے، وہ عوام کا کام نہیں (**الرحيل للإمام**)۔ ابن تیمیہ نے اُس وقت کے سلطان سے تاتای جارحیت کا دفاع کرنے کے لیے کہا تھا۔ انھوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ عوام بذاتِ خود لڑنا شروع کردیں، جیسا کہ موجودہ زمانے کے مسلمان کررہے ہیں۔ اسلام میں غیر ریاستی تنظیموں کو صرف پرامن جدوجہد کا حق ہے، مسلح جدوجہد کا حق ہرگز اُن کو حاصل نہیں۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے اور یہی ابن تیمیہ کا موقف بھی۔

احیاءِ اسلام

موجودہ زمانے میں احیاءِ اسلام سے کیا مراد ہے۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو قدیم روایتی زمین کے مقابلے میں جدید سائنسی زمین پر کھڑا کیا جائے، تاکہ اسلام آج کے ذہن کے لیے قابلِ فہم ہو سکے، وہ لوگوں کو عصر حاضر سے ریلیونٹ (relevant) نظر آئے۔

موجودہ زمانے میں اسلام کے احیاء کے لیے جو کام مطلوب ہے، اُس کام کو بنیادی طور پر حسب ذیل تین عنوانات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے:

1۔ مبنی بر ذہن روحانیت (mind-based spirituality)

2۔ مبنی بر عقل استدلال (reason-based argument)

3۔ مبنی بر امن عمل (peace-based activism)

مبنی بر ذہن روحانیت سے مراد یہ ہے کہ روحانیت یا تزکیہ کو مراقبہ (meditation) کے بجائے فکر و تدبر پر قائم کرنا۔ مراقبہ قلب کو مرکز بنا کر کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، تدبر عقلی غور و فکر کی سطح پر انجام دیا جاتا ہے۔ اس لیے قرآن میں تفکر اور تدبر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

مبنی بر عقل استدلال سے مراد وہی چیز ہے جس کو سائنسی استدلال کہا جاتا ہے، یعنی قیاسات و تمثیلات کے بجائے معلوم حقائق کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر ثابت کرنا۔ یہی موجودہ زمانے میں استدلال کا علمی طور پر مسلّم طریقہ ہے۔ مبنی بر امن عمل کا مطلب ہے تشدد سے مکمل طور پر بچتے ہوئے صرف پر امن ذرائع (peaceful means) سے اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کرنا۔ یہی موجودہ زمانے میں مقصد کے حصول کا زیادہ موثر طریقہ ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلّح طریقہ تخریب کے لیے کارگر ہوسکتا ہے، مگر تعمیر کے لیے وہ کارگر نہیں۔ اِس معاملے کی تفصیل کے لیے ہمارے یہاں کی مطبوعہ کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔ مثلاً انسان کی منزل، مذہب اور سائنس، امنِ عالم اور پیغمبر امن (Prophet of Peace)، وغیرہ۔

مسلم تاریخ کے تین دور

تعدیل (equation) کے اعتبار سے، مسلم تاریخ کے تین دور ہیں— پہلا دور وہ ہے جو رسول اور اصحاب رسول کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دور وہ ہے جب کہ مسلمانوں نے دنیا میں اپنا ایمپائر بنالیا تھا۔ یہ دور آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر سترھویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ تیسرا دور وہ ہے جس کو نوآبادیاتی دور (Colonial Period) کہا جاتا ہے۔ یہ دور اٹھارھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ یہ دور بیسویں صدی کے وسط میں عملاً ختم ہوگیا، لیکن نفسیاتی اعتبار سے، موجودہ زمانے کے مسلمان اب بھی اسی کے اثرات کے تحت جی رہے ہیں۔

مسلم تاریخ کے پہلے دور میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان جو تعدیل (equation) تھی، وہ داعی - مدعو کی تعدیل تھی۔ اِس دور میں مسلمان مثبت نفسیات میں جیتے تھے۔ دوسری قومیں ان کے لیے خیر خواہی (نُصح) کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ دوسرے دور میں یہ تعدیل بدل گئی۔ اب مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان حاکم - محکوم کی تعدیل قائم ہوئی۔ اِس تعدیل کے دور میں مسلمان احساسِ برتری کا شکار ہوگئے، وہ دوسری قوموں کے مقابلے میں اپنے آپ کو برتر سمجھنے لگے۔ مسلم تاریخ کا تیسرا دور وہ ہے جب کہ نوآبادیاتی طاقتوں نے مسلمانوں کے سیاسی ایمپائر کا خاتمہ کردیا۔ اب مسلمانوں کے درمیان تعدیل کا تیسرا دور آیا۔ اب مسلمان اپنے آپ کو مظلوم اور دوسری قوموں کو ظالم سمجھنے لگے۔

اِس تیسرے دور کی آمد پر مسلمان عام طور پر منفی نفسیات کا شکار ہوگئے۔ اِس دور میں مسلمانوں کے اندر تلخی اور شکایت اور احتجاج (protest) کا مزاج پیدا ہوگیا۔ یہ مزاج بڑھتے بڑھتے اُس انتہا پسندانہ ردعمل تک پہنچ گیا جس کو تشدد (violence) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمان عام طور پر اِسی تیسرے دور میں جی رہے ہیں۔ یہ دور، دوسرے لفظوں میں، نفسیاتی خودکشی (psychological suicide) کا دور ہے۔ آج سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اِس مہلک نفسیات سے باہر نکالا جائے۔

امتِ محمدی کی ذمے داری

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ ہر زمانے کے انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچتا رہے (25: 1)۔ پیغام رسانی کا یہ سلسلہ آدم سے لے کر پیغمبر آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جاری رہا۔ اِس پیغام رسانی کا مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں کے اندر حق کی طلب ہے، وہ حق کو پالیں۔ اور جو لوگ حق کے طالب نہیں، اُن کا منکر ہونا ایک ثابت شدہ واقعہ بن جائے۔ اِسی بنیاد پر آخرت کی عدالت میں دونوں فریقوں کے لیے جنت یا جہنم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ساتویں صدی کے رُبع اول میں آئے۔ آپ آخری پیغمبر تھے۔ آپ کے بعد اللہ کی طرف سے کوئی اور پیغمبر آنے والا نہیں (33: 40)۔ ختمِ نبوت کا یہ معاملہ کسی پُر اسرار سبب سے نہیں ہوا، اس کا سبب صرف یہ تھا کہ خدا کا کلام قرآن محفوظ ہوگیا (15:9)، اور اب یہ کافی ہوگیا کہ ہر زمانہ اور ہر نسل کے لوگوں تک اِس محفوظ قرآن کو پہنچا دیا جائے۔ گویا کہ اب قرآن، پیغمبر کا قائم مقام ہے۔ ختم نبوت کے بعد تحفظِ نبوت کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ نبوت کو مسلسل ہر دور میں جاری رکھنے کا مسئلہ ہے۔ اِس کی عملی صورت یہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ ہر زبان میں چھاپ کر لوگوں تک پہنچایا جائے اور مسلسل پہنچایا جاتا رہے۔

یہی امتِ محمدی کی اصل ذمے داری ہے۔ امتِ محمدی کا اللہ کی نظر میں امتِ محمدی قرار پانا، اِسی پر موقوف ہے کہ پیغام رسانی کا یہ کام کسی وقفے کے بغیر ہر دورِ تاریخ میں جاری رہے۔ پیغامِ نبوت کے اِس تبلیغِ عام کے مشن میں امتِ محمدی کے ہر فرد کو شریک ہونا ہے، حتی کہ اگر کوئی شخص علم نہ رکھتا ہو تو وہ قرآن کے چھپے ہوئے ترجمے حاصل کر کے اُسے لوگوں تک پہنچائے۔ ملت کے کسی فرد کا امتِ محمدی کا فرد ہونا، اِسی دعوتی کام کی ادائیگی پر موقوف ہے۔ جو لوگ اِس دعوتی کام کو انجام نہ دیں، وہ بلاشبہہ ایک انتہائی سنگین خطرہ مول لے رہے ہیں، وہ یہ کہ حشر کے میدان میں اُن سے یہ کہہ دیا جائے کہ تم امتِ محمدی سے الگ ہو جاؤ، امت محمدی سے تمھارا تعلق نہیں۔ امتِ محمدی کا فرد ہونے کے لیے جو چیز لازمی ہے، وہ خود ساختہ محمدی عشق نہیں ہے، بلکہ محمدی مشن میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے۔

دعوت، دعا

ہمارے مشن کے ایک صاحب جو دعوتی کام کرتے ہیں، انھوں نے پوچھا کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک شخص تک دعوت پہنچانا چاہتے ہیں، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص دعوت کو قبول کرنے والا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ دعوت کا فارمولا یہ ہے— جہاں دعوت کے مواقع ہوں، وہاں دعوہ ورک (Dawah work)، اور جہاں بظاہر دعوت کے مواقع دکھائی نہ دیں، وہاں دعا ورک (Dua work)

لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب ان کا کوئی ذاتی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور مسئلے کے حل کے لیے خدا سے دعا کرتے ہیں، لیکن دعوتی کام (Dawah work) کے معاملے میں وہ دعا کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔ حالاں کہ دعا کا تعلق جس طرح دوسری تمام چیزوں سے ہے، اُسی طرح اس کا تعلق دعوت سے بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعا، دعوت کے لیے لازمی جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ دعا کے بغیر دعوت کا کام موثر طور پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

دعا کا تعلق صرف مدعو سے نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق داعی سے بھی ہے۔ داعی کو چاہیے کہ وہ مسلسل طور پر خود اپنے لیے دعا کرتا رہے۔ وہ اللہ سے برابر موثر دعوت کی توفیق مانگتا رہے۔ وہ بار بار اِس کے لیے دعا کرتا رہے کہ اللہ اس کے لیے ایسے اسباب مہیا کر دے جس کے ذریعے وہ دعوت کا کام زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکے۔

یہی معاملہ مدعو کا ہے۔ داعی اپنے مدعو کا بہت زیادہ خیر خواہ ہوتا ہے۔ خیر خواہی کا یہ جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے مدعو کے حق میں برابر دعا کرتا رہے۔ دعوت کو قبول کرنا ہمیشہ اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ اللہ کی توفیق ہی سے کسی انسان کا دل حق کو قبول کرنے کے لیے کھلتا ہے۔ اللہ کی توفیق ہی سے کسی کی کنڈیشننگ ٹوٹتی ہے۔ اللہ کی توفیق ہی سے یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص دعوت پر سنجیدگی سے غور کرے۔ یہ تمام چیزیں تقاضا کرتی ہیں کہ داعی ہمیشہ اپنے مدعو کے لیے اللہ سے دعا کرتا رہے۔

مطالباتی سیاست کا نقصان

پچھلے سو سال کے درمیان مسلمانوں نے مختلف ملکوں میں بہت سی سیاسی تحریکیں چلائیں۔ اِن تمام تحریکوں کو اگر ایک نام دینا ہو تو وہ یہ ہوگا — مطالباتی سیاست، یعنی اپنے حقوق (rights) کو حاصل کرنے کے لیے مطالبہ (demand) اور احتجاج (protest) کی بنیاد پر عوامی تحریکیں چلانا، خواہ پرامن انداز میں یا تشدد کے انداز میں۔ اِن مطالباتی تحریکوں سے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو کوئی مثبت فائدہ نہیں ہوا، البتہ اِس کے نتیجے میں اُن کو ایسے نقصانات ہوئے جن کی تلافی بظاہر ممکن نہیں۔

مطالباتی سیاست، فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق، اِس دنیا میں کسی فرد یا قوم کو جو کچھ ملتا ہے، وہ صرف استحقاق (deservation) کی بنیاد پر ملتا ہے۔ مطالبہ اور شکایت اور احتجاج جیسی تحریکوں کے ذریعے اِس دنیا میں کسی کو کچھ ملنے والا نہیں۔ اِس قسم کی کوئی تحریک صرف اپنے نقصان میں اضافہ کے ہم معنی ہے، نہ کہ نقصان کو دور کرنے کے ہم معنیٰ۔

دوسرا اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان یہ ہے کہ مطالباتی سیاست نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو ایک عظیم نعمت سے محروم کر دیا۔ یہ نعمت دعا ہے، یعنی حقیقی جذبۂ طلب کے تحت پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ سے مانگنا۔ مطالباتی سیاست اِس قسم کی دعا کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ نے کسی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے (33:4)، اِس لیے جب آپ انسان کو نشانہ بنا کر اس کے مقابلے میں مطالباتی تحریک چلائیں تو فطری طور پر یہ ہوتا ہے کہ آپ کے اندر خدا سے مانگنے کی اسپرٹ پیدا نہیں ہوتی۔ ایسے انسان کے پاس خدا سے مانگنے کے لیے صرف رٹے ہوئے الفاظ باقی رہتے ہیں، اور رٹے ہوئے الفاظ کا نام دعا نہیں۔ دعا کی اسپرٹ (spirit) یہ ہے کہ — آدمی، خدا کو دینے والے (giver) کی حیثیت سے دریافت کرے اور پھر دل کی گہرائیوں کے ساتھ وہ خدا کے سامنے طالب بن جائے۔ موجودہ زمانے کے مسلمان اِس قسم کی حقیقی دعا سے محروم ہیں، اور اِس کا سب سے بڑا سبب یہی مطالباتی سیاست ہے۔

غیرِ خدا میں جینا

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا کیس ایک لفظ میں یہ ہے کہ — وہ خدا میں جینے والے نہیں بنے، وہ غیر خدا میں جی رہے ہیں۔ یہی واحد وجہ ہے جس نے تمام مسلمانوں کو منفی سوچ (negative thinking) میں مبتلا کر دیا ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں منفی سوچ اتنی زیادہ عام ہے کہ مشکل ہی سے اس میں کسی عورت یا مرد کا استثنا نظر آئے گا۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا لکھنا اور بولنا، سب کا سب ان کی منفی سوچ کا اظہار ہے۔

منفی سوچ کا سبب کیا ہے۔ منفی سوچ دراصل شکایت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ہر مسلمان کسی نہ کسی کے خلاف شکایت کا جذبہ لئے ہوئے ہے — فلاں نے زمین پر قبضہ کرلیا، فلاں نے اپنی فوجیں مسلم ملک میں اتار دیں، فلاں نے اسلام کی بے حرمتی کردی، فلاں نے ہم کو انصاف نہیں دیا، فلاں ہمارے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے، وغیرہ۔ ہر مسلمان اِس قسم کی شکایتوں میں جیتا ہے۔ اِنھیں شکایتوں نے ہر مسلمان کو منفی سوچ میں مبتلا کر دیا ہے۔ مگر منفی سوچ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ منفی سوچ کا مطلب دراصل یہ ہے کہ — انسان نے کسی اور چیز کو وہ اہمیت دے دی جو اہمیت اُسے خدا کو دینا چاہیے:

Making one's concern something else other than God.

خدا کو پانا سب سے بڑی چیز کو پانا ہے۔ جس آدمی کو خدا کی دریافت (discovery) ہوجائے، اس کی سوچ اتنی زیادہ بلند ہوجاتی ہے کہ ہر دوسری چیز اس کی نظر میں حقیر بن جاتی ہے۔ کسی چیز کا کھونا یا پانا دونوں اس کی نظر میں یکساں ہوجاتے ہیں۔ وہ اِس نفسیات میں جینے لگتا ہے کہ — تم جو چیز چاہو مجھ سے چھین لو، لیکن تم خدا کو مجھ سے نہیں چھین سکتے:

You can take away from me whatever you want to, but you cannot take God away from me!

یہ نفسیات ایک مومن کو انتہائی حد تک مثبت سوچ (positive thnking) والا انسان بنا دیتی ہے۔ کسی کے خلاف نفرت کا ایک ذرہ بھی اس کے اندر باقی نہیں رہتا۔

رزرویشن کے بغیر

یوپی بورڈ کے انٹرمیڈیٹ امتحانات (مارچ 2010) میں 10 طلبا نے ٹاپ کیا ہے۔ ٹاپ کرنے والے اِن طلبا میں دو مسلمان طالب علم ہیں۔ اُن کے نام یہ ہیں — انشا سیفی، محمد حسن سلمانی۔ (روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، 28 مئی 2010، صفحہ 8)

ہمارے رہنما یہ کہتے تھے مسلمانوں کے لیے تعلیم گاہوں میں رزرویشن (reservation) ضروری ہے۔ رزرویشن کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ لیکن تجربہ بتا رہا ہے کہ ترقی کے لیے رزرویشن سے زیادہ یقینی ذریعہ محنت ہے۔ 1947 کے بعد تمام مسلم رہنما، مسلم نوجوانوں کو یہ بتا رہے تھے کہ انڈیا اُن کے لیے ایک پرابلم کنٹری (problem country) ہے۔ تقریباً 50 سال تک مسلمان اِس منفی ذہن میں مبتلا رہے۔ اب مسلمانوں نے حالات کے تحت یہ دریافت کرلیا ہے کہ انڈیا میں اُن کے لیے ہر قسم کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ اِس دریافت نے اب مسلمانوں کے اندر نیا جوش پیدا کردیا ہے۔ وہ کوشش کرکے ہر میدان میں تیزی سے ترقی کررہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ترقی کرنے کی خواہش ہر انسان کے اندر فطری طور پر موجود رہتی ہے۔ اگر انسان کو غلط رہنمائی کرکے مایوسی میں مبتلا نہ کیا جائے، تو وہ خود اپنے فطری جذبے کے تحت کوشش کے راستے پر چل پڑے گا اور محنت کرکے وہ کامیابی تک پہنچ جائے گا۔

سب سے بڑی رہنمائی یہ ہے کہ انسان کے اندر اپنے ماحول کے بارے میں مایوسی کا جذبہ نہ پیدا کیا جائے۔ اِس قسم کی قیادت جھوٹی قیادت ہے۔ سچی قیادت وہ ہے جو انسان کے اندر امید پیدا کرے، جو حوصلہ بڑھانے والی باتیں کرے، جو مسائل (problems) کے بجائے مواقع (opportunities) کی نشان دہی کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس آدمی کے پاس صرف مایوسی پیدا کرنے والی خبریں ہوں، اُس پر فرض ہے کہ وہ چپ رہے — خدا کی اِس دنیا میں بولنے کا حق صرف اُس آدمی کو ہے جو لوگوں کو امید کی روشنی دکھائے۔

ڈی کنڈیشننگ کا طریقہ

ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ یہی ماحول ہر آدمی کا ذہن بناتا ہے۔ ذہنی تاثر پذیری کے اِسی عمل کو کنڈیشننگ (conditioning) کہا جاتا ہے۔ یہی بلا استثنا ہر آدمی کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی کا ذہن کنڈیشنڈ ذہن (conditioned mind) ہے۔ یہی ہر آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ یہ کنڈیشننگ ہر آدمی کو فطرت سے ہٹا دیتی ہے۔ اِس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ ہر آدمی کی ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) کر کے اس کو فطرت کی طرف واپس لایا جائے۔

اِس ڈی کنڈیشننگ کا صرف ایک طریقہ ہے، اور وہ محاسبہ (introspection) ہے، یعنی سخت انداز میں مسلسل طور پر اپنی اصلاح کا عمل جاری رکھنا۔ کسی آدمی کی یہ اصلاح دو طریقے سے ہوتی ہے — یا تو وہ دوسرے شخص کی سخت تنقید کو برداشت کرے، یعنی خارجی ہیمرنگ (hammering) کو کھلے ذہن کے ساتھ قبول کرے۔ وہ برا مانے بغیر دوسرے شخص کی سخت تنقید کو سن کر اپنے آپ پر نظر ثانی (reassessment) کا عمل کرے۔

اس ڈی کنڈیشننگ کا دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو شدید خود احتسابی (self-hammering) کہا جا سکتا ہے، یعنی آدمی اپنے آپ کو دشمن جیسی نظر سے دیکھے۔ وہ ہر صبح و شام اپنا جائزہ لیتا رہے، وہ اپنی ہر غلطی کو شدت کے ساتھ محسوس کرے اور اس کو لے کر اپنا سخت محاسبہ کرے، وہ اپنے اوپر بے رحمانہ تنقید (merciless hammering) کرتا رہے، کسی معاملے میں وہ ہرگز اپنے آپ کو رعایت نہ دے، وہ دوسرے کو الزام دینے کے بجائے ہمیشہ خود اپنے آپ کو ملزم ٹھہرائے، وہ اپنے بارے میں اتنا سخت ناقد بن جائے جیسے کہ وہ اپنا ذبیحہ کر رہا ہے۔

ڈی کنڈیشننگ کے یہی دو ممکن طریقے ہیں — آدمی یا تو دوسرے کی بے رحمانہ تنقید کو برداشت کرے، یا وہ خود اپنا بے رحم ناقد بن جائے۔ جو آدمی دوسروں سے میٹھی بات سننا چاہے اور خود ہمیشہ اپنی رعایت کرتا رہے، ایسا آدمی ہمیشہ کنڈیشننگ میں جیے گا، اس کی کبھی ڈی کنڈیشننگ ہونے والی نہیں۔

اتباعِ یہود کا کیس

ڈاکٹر محمد اقبال (وفات: 1938) برصغیر ہند کے عظیم مسلم مفکر مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے بارے میں کئی باتیں لکھی ہیں۔ اُن کا ایک مصرعہ یہ ہے:

یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں یہود کی جو صفات آئی ہیں، اُن میں سے ایک ہے — اپنے کو مظلوم بتا کر دوسروں کے ظلم پر احتجاج کرنا۔ یہ بلاشبہہ یہود کی صفت ہے۔ اِس مزاج سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلمان اِسی یہودی مزاج کا شکار ہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہود کے اندر جب دینی بگاڑ آیا تو انھوں نے دعوتی ذمے داری کو چھوڑ دیا (3: 187)، وہ دوسروں کی طرح صرف ایک قوم بن کر رہ گئے۔ اِس غفلت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہود پر اپنی تنبیہات (warnings) بھیجیں۔ یہ تنبیہات آسمان سے نہیں آئی تھیں، بلکہ وہ اسباب کی صورت میں انسانوں کے ذریعے اُن پر بھیجی گئی تھیں (5: 17)۔ مثلاً بابل (عراق) کے حکمراں بخت نصر (Nebuchadnezzar) کے ذریعے 586 قبل مسیح میں، اور رومی حکمراں ٹائٹس (Titus) کے ذریعے 70 عیسوی میں۔

مگر یہودی علماء اور قائدین (religious leaders) نے یہ کیا کہ ایسے تمام واقعات کو انھوں نے خدائی تنبیہہ کے بجائے انسانی ظلم کے خانے میں ڈال دیا۔ یہودی لٹریچر اِس قسم کی داستانوں سے بھرا ہوا ہے۔ اِس پر یہودی علماء نے کثرت سے کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً:

Hasidic Tales of the Holocausts, by Eliach Y, New York, 1982

یہودی علماء کی اِس روش کی بنا پر ایسا ہوا کہ جن واقعات کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اُن سے متنبہ ہو کر خدا کی طرف رجوع کریں، اِس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ اِن واقعات کو کچھ انسانوں کی طرف منسوب کر کے انھوں نے اُن لوگوں کے خلاف شکایت (complaint) اور احتجاج (protest) کا

ایک پورا کلچر چلا دیا۔ یہ شکایتی کلچر اتنا بڑھا کہ لغت (dictionary) میں باقاعدہ ایسے الفاظ شامل ہوگئے جو یہود کے اوپر دوسروں کے ظلم کو بتانے کے لیے وضع ہوئے تھے۔ گویا کہ ظلمِ یہود کی ایک مستقل ڈکشنری تیار ہوگئی، ظلم یہود کا اتنا زیادہ چرچا ہوا کہ وہ لٹریچر کا ایک جز بن گیا۔

یہودی لٹریچر کا مطالعہ کرکے اُن الفاظ واصطلاحات کو معلوم کیا جاسکتا ہے جو کثرتِ استعمال سے لٹریچر کا جز بن گئے، حتی کہ وہ ڈکشنری میں شامل ہوگئے۔ اِن میں سے کچھ الفاظ یہ ہیں:

Pogrom: Organized killing of Jews

Holocaust: Killing of millions of Jews by the Nazis,

Diaspora: Dispersion of the Jews after the Babylonian exile,

Ghetto: Jewish Slum outside the city as a sign of discrimination.

حدیث میں آیا ہے کہ بعد کے زمانے کے مسلمان یہود کے طریقے کی پیروی کریں گے۔ (لتتبعن شبراً بشبرٍ وذراعاً بذراعٍ)۔ یہ اتباعِ یہود صرف سحر وعملیات جیسی چیزوں میں نہیں ہوگا، بلکہ وہ مذکورہ قسم کی سنتِ یہود کے بارے میں بھی ہوگا۔ یہود میں یہ خرابیاں زوال (degeneration) کے نتیجے میں آئی تھیں۔ یہی خرابیاں دوبارہ زوال کے نتیجے میں خود مسلمانوں کے اندر بھی یقینی طور پر پیدا ہوں گی۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں یہ خرابی عمومی طور پر پیدا ہوچکی ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمان، عرب اور غیر عرب دونوں آخری حد تک اِس کا شکار ہوچکے ہیں۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے تقریباً تمام لکھنے اور بولنے والے صرف ایک کام کررہے ہیں، اور وہ ہے اپنے مسائل کا الزام دوسروں پر عائد کرکے ان کے خلاف شکایت اور احتجاج کا طوفان برپا کرنا۔ ہر ایک کو مسلم مسائل کے پیچھے ''اغیار'' کی سازش اور دشمنی دکھائی دیتی ہے۔

یہ بلاشبہہ یہودی روش ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مسلمان اِس روش سے توبہ کریں، وہ خود اپنے اوپر نظرِ ثانی کریں۔ وہ اِس صورتِ حال کو خدا کا انتباہ (warning) قرار دے کر خود اپنی کمیوں اور کمزوریوں کو دریافت کریں اور ساری توجہ خود اپنی اصلاح پر لگادیں، نہ کہ مفروضہ ظالموں کے خلاف ہنگامہ آرائی کرکے

وہ خدا کے غضب میں مزید اضافہ کریں۔ اِس کے بغیر اُن کے حالات ہرگز بدلنے والے نہیں۔

خدائی انتباہ کے معاملے کو مفروضہ دشمنوں کی طرف منسوب کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک واقعہ کو غلط طور پر کسی اور سے منسوب کرنا ہے۔ اِس قسم کا مزاج کسی فرد یا قوم کو بہت بڑا فکری نقصان پہنچاتا ہے، اور وہ ہے معاملات کے صحیح تجزیہ (analysis) سے محرومی۔ کامیاب منصوبہ بندی ہمیشہ صحیح تجزیہ پر مبنی ہوتی ہے۔ جب صحیح تجزیہ نہ ہو تو کامیاب منصوبہ بندی بھی عملاً ناممکن ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر 1948 میں بال فور کمیشن (Balfour Commission) کے تحت، فلسطین کی تقسیم عمل میں آئی۔ فلسطین کا تقریباً نصف حصہ یہود کو ملا، اور تقریباً نصف حصہ عرب مسلمانوں کو دیا گیا۔ بظاہر یہ واقعہ انسان کے ذریعہ پیش آیا، لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ اُسی قسم کا ایک خدائی معاملہ تھا جو اِس سے پہلے اِسی ارضِ فلسطین میں یہود کے ساتھ پیش آیا تھا۔ دونوں کے درمیان ظاہری صورت کے اعتبار سے فرق ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے، اُن کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

ماضی میں یہود کے ساتھ جب ایسا واقعہ پیش آیا تو انھوں نے اس کو خدائی واقعہ کے بجائے انسانی واقعہ سمجھا۔ انھوں نے یہ کیا کہ متعلق انسانوں کو اپنا دشمن قرار دے دیا، وہ اُن کے خلاف منفی سوچ اور منفی سرگرمیوں میں مبتلا ہو گئے۔ جو واقعہ اُن سے خدا کی طرف رجوع کا تقاضا کر رہا تھا، وہ اُن کے غیر حقیقی رسپانس کے نتیجے میں اُن کے لیے خدا سے مزید دوری کا سبب بن گیا۔

ٹھیک یہی معاملہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ 1948 کے بعد مسلمان، عرب اور غیر عرب دونوں نے وہی غیر حقیقی رسپانس دیا جو اِس سے پہلے یہود نے دیا تھا۔ ذاتی محاسبہ کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ انھوں نے یہود اور یہود کے مفروضہ حلیفوں کے خلاف ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔ اِس کا نتیجہ فطری طور پر برعکس صورت میں نکلا۔ 1948 میں جو کچھ اُنھیں ملا تھا، 60 برس سے زیادہ مدت کی غیر معمولی قربانیوں کے باوجود انھوں نے اس کو بھی کھو دیا۔ آج تحریکِ فلسطین اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر پا رہی ہے جہاں اس کے پاس مایوسی اور محرومی کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہے۔ 57 ملکوں میں مسلمانوں کا

سیاسی اقتدار قائم ہے۔ اِس کے علاوہ، دنیا کے تقریباً ہر ملک میں مسلمان موجود ہیں۔ ہر جگہ وہ ایک ہی قسم کی بولی بول رہے ہیں، اور وہ یہ کہ — ہم دشمنوں کے محاصرہ (seige) میں ہیں، ہمارے خلاف سازشیں کی جارہی ہیں، عالمی میڈیا ہماری تصویر بگاڑنے میں مصروف ہے، ہمارے ساتھ ہر جگہ امتیاز کا سلوک کیا جاتا ہے، ہم کو دوسرے درجے کا شہری (second class citizen) بنا دیا گیا ہے، وغیرہ۔

اِس قسم کی تمام باتیں بلا شبہہ سنتِ یہود کی پیروی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے خدا کے دین کو دینِ مہجور (30 :25) بنا دیا ہے، انھوں نے دعوت الی اللہ کی ذمے داری کو ترک کر دیا ہے، انھوں نے اسلام کی اسپرٹ کو بھلا دیا ہے، وہ اسلام کو صرف بطور فارم لیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی قومی سرگرمیوں کو اسلام کا نام دے رکھا ہے، وہ انسانوں سے نفرت کرتے ہیں، جب کہ اُنھیں انسانوں کا خیر خواہ بننا چاہیے تھا، آج کے مسلمانوں کا کنسرن (concern) خدا نہیں ہے، بلکہ وہی مادی مفادات ہیں جو دوسری قوموں کا کنسرن بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی سوچ تمام تر دنیا رُخی سوچ بنی ہوئی ہے، جب کہ اس کو خدا رخی سوچ بننا چاہیے، اسلام اب اُن کے لیے فخر (pride) کا موضوع ہے، نہ کہ اتباع کا موضوع، مسلم معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عملاً ختم ہو گیا ہے، مسلمانوں کے تقریباً تمام لکھنے اور بولنے والے عملاً اپنی قوم کے ترجمان ہیں، نہ کہ خدا کے دین کے ترجمان، وغیرہ۔

یہ تمام چیزیں مسلمانوں کے زوال کی کھلی علامت ہیں۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب اُن کے اِسی زوال کی بنا پر خدا کی تنبیہات ہیں، نہ کہ انسانوں کا ظلم۔ مگر مسلمان اِن واقعات کو انسانوں کی طرف منسوب کر کے ان کے خلاف چیخ وپکار میں مشغول ہیں۔ مسلمانوں پر فرض کے درجے میں ضروری ہے کہ وہ اِس منفی روش کو مکمل طور پر ختم کر دیں۔ وہ دوسروں سے نفرت کو چھوڑ دیں اور خود اپنی کوتاہیوں کی اصلاح کریں، یہی مسلمانوں کے تمام مسائل کا واحد حل ہے۔ اِس کے سوا دوسری ہر چیز صرف اُن کی تباہی میں اضافہ کرے گی، وہ ان کی فلاح کا سبب بننے والی نہیں۔

حق کی تلاش

امریکی صحافی الون ٹافلر (Alvin Toffler) کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس کا نام یہ ہے—

فیوچر شاک: Future Shock

یہ کتاب پہلی بار 1970 میں چھپی۔ اب تک اس کے 5 ملین سے زیادہ نسخے ساری دنیا میں فروخت ہو چکے ہیں، نیز دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

الون ٹافلر نے اپنی کتاب میں ایک سیمنار (seminar) کا واقعہ لکھا ہے۔ اِس سیمنار میں کنارے کی سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ جب سب لوگ بول چکے تو آخر میں وہ آدمی اٹھا۔ اس نے کہا— میرا نام چارلس اسٹین ہے۔ میں تمام عمر سوئی کے ایک کارخانے میں کام کرتا رہا ہوں۔ میری عمر 77 سال ہے۔ میں وہ چیز پانا چاہتا ہوں جو میں اپنی نوجوانی کی عمر میں نہ پا سکا۔ میں مستقبل کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں ایک تعلیم یافتہ انسان کی حیثیت سے مرنا چاہتا ہوں:

My name is Charles Stein. I am a needle worker all my life. I am seventy-seven years old, and I want to get what I did not get in my youth. I want to know about the future. I want to die an educated man. (page 427)

گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو مذکورہ آدمی کا مسئلہ حقیقۃً معرفت یا ادراکِ حقیقت تھا، نہ کہ سادہ طور پر صرف ایجوکیشن۔ گویا کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ یہ کہہ رہا تھا کہ میں ایک صاحبِ معرفت انسان (realized man) کی حیثیت سے مرنا چاہتا ہوں۔

یہی ہر انسان کی نفسیات ہے۔ ہر انسان اِس نفسیات میں جی رہا ہے کہ وہ حقیقت کا ادراک نہ کر سکا۔ گویا کہ ہر انسان اِس تلاش میں ہے کہ وہ یہ جان سکے کہ سچائی کیا ہے۔

ہر انسان معرفت کی تلاش میں ہے۔ خوش قسمت انسان وہ ہے جو معرفت کو پالے۔ اُس پر موت آئے تو اِس حال میں آئے کہ وہ ایک صاحبِ معرفت انسان بن چکا ہو۔

افرادِ کار کی تیاری

ایک مسلم رہنما نے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا— میرا مقصد عصرِ حاضر کے اعتبار سے، افرادِ کار کی تیاری ہے۔ اِس جلسے میں ایک مسلم نوجوان موجود تھا۔ بعد کو یہ نوجوان مذکورہ مسلم رہنما سے ملا۔ اس نے کہا کہ میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ مجھ کو آپ اپنے مطلوب انسان کی حیثیت سے تیار کیجئے، مگر مذکورہ مسلم رہنما نے نوجوان کی اِس پیش کش پر دھیان نہیں دیا۔ انھوں نے کہا کہ— تم تو صرف ایک شخص ہو۔ جب اِس طرح کے کئی لوگ اکھٹا ہو جائیں گے، اُس وقت میں افراد کی تیاری کے بارے میں اپنا پروگرام شروع کروں گا۔ موجودہ زمانے میں بہت سے لوگوں نے یہ کہا کہ وہ عصرِ حاضر کے اعتبار سے، افرادِ کار تیار کرنا چاہتے ہیں، لیکن اِن میں سے کوئی شخص مطلوب انداز میں یہ کام نہ کرسکا۔ مذکورہ واقعہ بتاتا ہے کہ اِس کا سبب کیا ہے۔ یہ تمام لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ بھیڑ (crowd) کے سامنے تقریریں کرکے افرادِ کار تیار کریں، حالاں کہ افرادِ کار کی تیاری بھیڑ کو خطاب کرنے سے نہیں ہوتی۔ اُس کا طریقہ صرف ایک ہے اور وہ ہے— فرد پر فوکس کرنا، فرد کی نسبت سے سوچنا اور فرد کی نسبت سے تربیت کا پروگرام بنانا۔ اصل یہ ہے کہ رہنما سب سے پہلے افراد کے ذہن کو بخوبی طور پر سمجھنے کی کوشش کرے، وہ افراد کے ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو تیار کرے۔ رہنما جب اِس طرح اپنے آپ کو تیار کرکے بولے گا تو اس کی زبان قولِ بلیغ (4:63) کی زبان بن جائے گی، اس کی بات ہر ذہن کو ایڈریس کرے گی، اس کی بات ہر فرد کے اندر یہ داعیہ پیدا کرے گی کہ وہ اپنے آپ کو تیار کرکے مطلوب انسان بنائے۔ یہی وہ طرزِ خطاب ہے جس کے ذریعے افرادِ کار کو تیار کیا جاسکتا ہے۔

اِس کے برعکس، جو لوگ بھیڑ کو لے کر سوچتے ہیں، جو اپنے آس پاس بھیڑ دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کا طرزِ خطاب فطری طور پر جذباتی ہو جاتا ہے۔ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسی بات بولنے لگتے ہیں جو بھیڑ کو خوش کرے۔ اِس عوامی طرزِ خطاب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا ذہنی ارتقا رک جاتا ہے، اور جس آدمی کا خود اپنا ذہنی ارتقا رک جائے، وہ ہرگز افرادِ کار کی تیاری کا عمل انجام نہیں دے سکتا۔

شتمِ رسول کا مسئلہ

پاکستان کے صوبہ پنجاب کے گورنر مسٹر سلمان تاثیر (عمر 66 سال) کو اسلام آباد میں 4 جنوری 2011 کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اخباری اطلاع کے مطابق، ان کو گولی مارنے والا خود اُن کا باڈی گارڈ ممتاز حسین قادری (عمر 26 سال) تھا۔ اس نے گورنر کے اوپر سرکاری گن سے فائرنگ کی۔ اِس حملے میں گورنر پنجاب کو 6 گولیاں لگیں۔ وہ فوراً ہی ہلاک ہو گئے۔ پولس نے قاتل کو گرفتار کر لیا۔ پولس کا کہنا ہے کہ قاتل کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ حراست میں لیے گئے ملزم نے اعتراف کیا ہے کہ اُس نے یہ حملہ اِس لیے کیا کہ گورنر پنجاب نے پاکستان کے ناموسِ رسالت قانون کو ایک کالا قانون کہا تھا۔ (روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، 5 جنوری، صفحہ 12؛ ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، 5 جنوری 2011، صفحہ 1)۔

اِس طرح کسی فرد کا کسی شخص کو گولی مار کر ہلاک کرنا بلاشبہہ اسلام میں حرام ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ناموسِ رسالت کا قانون ایک بے بنیاد قانون ہے۔ اگر کوئی شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف وہ فعل کرے جس کو سب وشتم کہا جاتا ہے، تب بھی اس کا جواب دلیل سے دیا جائے گا، نہ کہ گولی سے۔ بالفرض اگر ایسا کوئی قانون ہو، تب بھی شاتمِ کے خلاف کوئی عام آدمی کارروائی نہیں کر سکتا۔ وہ صرف یہ کر سکتا ہے کہ وہ ایسے شاتم کے معاملے میں عدالت سے رجوع کرے اور پھر باقاعدہ عدالتی کارروائی کے بعد عدالت جو فیصلہ کرے، اس کے مطابق، اس پر عمل کیا جائے۔

موجودہ زمانے کے مسلمان ہر جگہ شتمِ رسول (blasphemy) کے نام پر اِسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں، کہیں جلوس اور مظاہرے کی صورت میں اور کہیں شاتم کو قتل کرنے کی صورت میں۔ اس کے نتیجے میں مفروضہ شتم تو بند نہیں ہوا، البتہ اسلام بہت زیادہ بدنام ہو گیا۔ جو لوگ کسی کو شاتمِ رسول قرار دے کر اُس کے خلاف کارروائی کرتے ہیں، وہ خود شاتم سے بھی زیادہ بڑے مجرم ہیں۔ ایسے لوگ کسی بھی حال میں خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

سزا کا تعلق خدا سے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں داعی الی اللہ (33: 46) کہا گیا ہے۔ اِس دعوتی مشن کو انجام دینے کے لیے آپ کو قرآن میں جو ہدایت دی گئیں، اُن میں سے ایک ہدایت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **فاصدع بما تؤمر وأعرض عن المشركين. إنا كفيناك المستهزئين** (15: 94-95) یعنی جس چیز کا تم کو حکم ملا ہے، اس کو تم واضح طور پر لوگوں کے سامنے بیان کردو، اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ ہم تمھاری طرف سے اِن استہزا کرنے والوں کے لیے کافی ہیں۔

اِن آیات کو اس کے سببِ نزول کے اعتبار سے دیکھئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ داعی کو اپنی ساری توجہ دعوت کے کام میں لگانا چاہیے۔ اِس کے بعد اگر ایسا ہوتا ہے کہ مدعو گروہ کی طرف سے منفی رد عمل سامنے آتا ہے، وہ داعی کا مذاق اڑاتے ہیں، وہ داعی کا سب وشتم کرتے ہیں، وہ داعی کو لوگوں کی نظر میں گھٹانے کے لیے توہین واستہزا کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، تو ایسی حالت میں داعی کو چاہیے کہ وہ ردعمل کی نفسیات سے بچتے ہوئے یک طرفہ اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ اپنی دعوت کو مزید مدلل کرنے کی کوشش کرے، حتی کہ وہ ایسے لوگوں کی اصلاح کے لیے اپنے رب سے دعا کرے۔ وہ کہے کہ خدایا، تو اِن مخالفین کو میرا ساتھی بنادے، تو ان کو اپنی رحمت کے سائے میں لے لے۔ اِس کے بعد جہاں تک استہزا کرنے والوں کے استہزا کا معاملہ ہے، وہ اس کو پوری طرح خدا پر چھوڑ دے۔ داعی کا کام صرف پرامن دعوت ہے، اس کا کام لوگوں کو سزا دینا نہیں (88: 21-22)۔

سب وشتم کی حیثیت دراصل آزادی کے غلط استعمال کی ہے۔ سب وشتم کی حیثیت جرم مستوجبِ سزا (cognizable offense) کی نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ شاتم کو پُرامن نصیحت کی جائے گی، اُس کو مجرم قرار دے کر اس کو جسمانی سزا نہیں دی جائے گی۔ اِس معاملے میں نصیحت کا تعلق داعی سے ہے اور سزا کا تعلق خدا سے۔ داعی اگر شاتم کو سزا دینے کی کوشش کرے تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خدا کے کام کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتا ہے، اور ایسا کرنا بلاشبہہ ایک سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

عفوودرگزر کا حکم

قرآن کی سورہ الجاثیہ میں ایک آیت آئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: **قل للذین آمنوا، یغفروا للذین لا یرجون أیّام اللہ، لیجزیَ قوماً بما کانوا یکسبون** (45:14) یعنی ایمان والوں سے کہہ دو کہ وہ اُن لوگوں کے ساتھ عفوودرگزر کا معاملہ کریں جو ایّام اللہ کے ظہور کی توقع نہیں رکھتے، تاکہ اللہ ایک قوم کو اُس چیز کا پورا بدلہ دے جو وہ کرتی رہی ہے۔

قرآن کی اِس آیت کی تشریح میں مفسر القرطبی نے لکھا ہے: **نزلت الآیۃ بسبب أن رجلاً من قریش شتمَ عمر بن الخطاب، فھمّ أن یبطش بہ** (تفسیر القرطبی 16/161) یعنی یہ آیت اِس واقعے کے بعد اتری کہ قریش کے ایک آدمی نے عمر بن الخطاب کا سب وشتم کیا۔ عمر نے چاہا کہ وہ اس کو پکڑیں اور ماریں۔ اِس موقع پر قرآن میں یہ ہدایت اتری۔

قرآن کی اِس آیت سے اور اِس قسم کی دوسری آیتوں سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ سب وشتم کا معاملہ قانونی سزا (legal punishment) کا معاملہ نہیں ہے۔ کوئی شخص نعوذ باللہ، خدا کا استہزاء کرے، وہ صحابہ کا استہزا کرے، وہ قرآن کا استہزا کرے، تو اِس بنیاد پر اُس کو قانونی مجرم قرار دے کر قانونی سزا نہیں دی جائے گی۔ اِس معاملے میں سزا کا تعلق تمام تر اللہ سے ہے۔ اللہ اپنے علم کے مطابق، ایسے لوگوں کو جو سزا دینا چاہے گا، وہ سزا دے گا۔ ایسے معاملے میں کسی شخص کو سزا دینا اسلام کی حمایت کے نام پر اسلام کے ساتھ بدترین عداوت کے ہم معنیٰ ہے۔

سب وشتم کے معاملے میں مسلمانوں کو جو کرنا ہے، وہ یہ کہ وہ ایسے شخص کے لیے دعا کریں، وہ اُس سے مل کر اُس کو نصیحت کریں، وہ اس کو دلائل کے ذریعے مطمئن کرنے کی کوشش کریں، وہ اس کی اصلاح کی پرامن جدوجہد کریں، وہ اس کو جسمانی سزا دینے کا کام اپنے ذمے نہ لیں۔ مومن کی حیثیت اِس دنیا میں داعی کی ہے، نہ کہ داروغہ (88:21-22) کی۔

شتم اور ارتداد

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام میں شتمِ رسول کی سزا قتل ہے۔ اِسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ

اسلام میں ارتداد (apostasy) کی سزا قتل ہے۔ شتم اور ارتداد کی اِس سزا کو حد (legal punishment) کا درجہ دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ شاتم یا مرتد کو بطور حد قتل کیا جائے گا (یُقتل حدًّا)۔

یہ قانون اسلام کے بعد کی تاریخ میں عباسی دور (750-1258ء) کے فقہاء نے بنایا، مگر اصل اسلامی ماخذ میں اِس قسم کا کوئی حکم موجود نہیں۔ اِس لیے عین جائز ہے کہ اس حکم کو کالعدم سمجھا جائے اور اس کو غیر اسلامی قرار دے کر رد کر دیا جائے۔

اسلامی تاریخ کے مکی دور میں جو اہلِ ایمان ہجرت کر کے حبش (Abyssinia) گئے تھے، اُن میں سے ایک شخص کا نام عبید اللہ بن جحش تھا۔ حبش ایک عیسائی ملک تھا۔ وہاں جا کر عبید اللہ بن جحش عیسائی مذہب سے متاثر ہوئے اور اعلان کے ساتھ اسلام کو چھوڑ دیا۔ یہ واضح طور پر ارتداد کا ایک واقعہ تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ عبید اللہ بن جحش مرتد ہو گئے ہیں، اُن کو بطور حد قتل کر دو۔ اِس واقعے سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ محمدی میں ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے۔ اِسی طرح مدینہ میں ایک شخص تھا۔ اس کا نام عبد اللہ بن اُبی تھا۔ یہ شخص کھلے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شتم کرتا تھا، لیکن رسول اللہ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ عبد اللہ بن ابی نے شتم رسول کے جرم کا ارتکاب کیا ہے، اِس لیے اس کو بطور حد قتل کر دو۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں سماجی جرم (social crime) پر سزا ہے، اسلام میں اعتقادی جرم (ideological crime) پر کوئی سزا نہیں۔ شاتم اور مرتد کے لیے تبلیغ و نصیحت ہے، نہ کہ قتل کا حکم۔

● الرسالہ کے تمام قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنا ای میل اور ٹیلی فون نمبر روانہ فرمائیں۔ ای میل یا فون نمبر کی تبدیلی کی صورت میں اس کو اپ ڈیٹ کرنا ضروری ہے۔ مطلوبہ تفصیل ایس ایم ایس کے ذریعہ بھی روانہ کر سکتے ہیں۔ مکمل ایڈریس لکھنے کے بجائے اپنے خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کے ساتھ صرف اپنا نام اور مقام (مع ضلع اور صوبہ) واضح فرمائیں:

znadwi@yahoo.com, Mob. 098994 30625

● صدر اسلامی مرکز کا ''اردو ترجمہ قرآن'' پاکٹ سائز میں چھپ کر گڈ ورڈ (Goodword) سے شائع ہو چکا ہے۔

تحفظِ نبوت، تحفظِ کارِ نبوت

موجودہ زمانے میں مسلم تنظیمیں اور مسلم ادارے جگہ جگہ تحفظِ ختمِ نبوت کے نام سے جلسے کررہے ہیں۔ اِن موقعوں پر مسلمانوں کی بھیڑ اکھٹا ہوتی ہے، مقررین پر جوش تقریریں کرتے ہیں۔ وہاں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم ہر قیمت پر ختمِ نبوت کا تحفظ کریں گے۔ مگر اِس قسم کے جلسے اور تقریریں سراسر بے معنی ہیں۔ ان کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

قرآن میں اعلان کیا گیا تھا کہ اللہ خاتم النبیین کی حفاظت فرمائے گا (5:67)۔ اللہ اپنے آخری کلام قرآن کو ہمیشہ محفوظ رکھے گا (15: 9)۔ اللہ کا یہ فیصلہ پورا ہوا۔ دنیا میں ایسے حالات پیدا ہوئے جس کے بعد خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ اور آپ کی لائی ہوئی تعلیم پوری طرح محفوظ ہوگئی۔ قرآن پرنٹنگ پریس کے زمانے میں پہنچ کر آخری طور پر محفوظ ہوگیا۔ اب مسئلہ ختم نبوت کے تحفظ کا نہیں ہے، بلکہ اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ کارِ نبوت (دعوت الی اللہ) کو ہر زمانے میں مسلسل طور پر جاری رکھا جائے۔

کارِ نبوت سے مراد وہی کام ہے جس کو قرآن میں تبلیغ ما انزل اللہ (5:67) کہا گیا ہے۔ پیغمبر اسلام کا مشن دراصل دعوتی مشن تھا۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اِس دعوتی مشن کو ہر قوم میں اور ہر زمانے میں جاری رکھیں۔ وہ دعوت وتبلیغ کے کام میں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم مقامی کریں۔ یہی کرنے کا اصل کام ہے اور یہی امتِ محمدی کی اصل ذمے داری۔

اصل یہ ہے کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا، لیکن پیغام نبوت کا سلسلہ جاری ہے۔ اب مسلمانوں کی ذمے داری یہ نہیں ہے کہ وہ نعت خوانی کریں، یا گستاخِ رسول کو قتل کریں، یا تحفظ ختم نبوت کے جلسے کریں۔ یہ سب غیر متعلق کام ہے، اصل کام یہ ہے کہ تمام انسانوں تک خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے قرآن کو پہنچایا جائے، ہر زمانے کے لوگوں کو اس کے پیغام سے باخبر کیا جائے— تحفظ، خدا کا کام ہے اور دعوت اہلِ اسلام کا کام۔

اعتماد کی اہمیت

سماجی زندگی میں اعتماد (trust) کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ یہ کسی آدمی کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے کہ وہ لوگوں کی نظر میں قابلِ اعتماد بن جائے۔ اِس قسم کا اعتماد کسی کو بہت دیر میں حاصل ہوتا ہے۔ لمبے تجربات کے بعد ہی کسی شخص کو یہ درجہ ملتا ہے کہ وہ لوگوں کی نظر میں ایک قابلِ اعتماد انسان بن سکے۔

کچھ لوگوں کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو بے وقوف بنا کر پیسہ کمانا چاہتے ہیں، وہ جھوٹ بول کر لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ ایسے لوگ زندگی میں کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ بڑی کامیابی ہمیشہ سچائی کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔ دھوکا ایک بار کام آسکتا ہے، لیکن سچائی ہزار بار کام آتی ہے۔ دھوکے کی حد ہے، مگر سچائی کی کوئی حد نہیں۔

جو لوگ خوش نما باتیں کر کے پیسہ کمانا چاہتے ہیں، وہ بہت جلد لوگوں کی نظر میں مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ آخر کار اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کی باتوں پر بھروسہ نہیں کرتے، لوگ اُن سے معاملہ کرنا چھوڑ دیتے ہیں، لوگوں کو ان کی باتوں پر یقین نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ چند بار کچھ حاصل کر لیتے ہیں، لیکن بہت جلد ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اُن سے کٹ جاتے ہیں۔ لوگوں کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ اِن سے دور رہو۔

کامیابی کیا ہے۔ کامیابی ہمیشہ دوسروں کی قیمت پر ہوتی ہے۔ مثبت بنیاد پر دوسروں سے فائدہ اٹھانے ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔ لیکن دوسروں سے فائدہ اٹھانا، صرف اُس کے لیے ممکن ہوتا ہے جو خود بھی دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ دوسروں سے فائدہ لینا ہمیشہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے بعد ہی ممکن ہوتا ہے۔ یہ ایک دوطرفہ (bilateral) معاملہ ہے۔ جو آدمی دوسروں کو کوئی حقیقی فائدہ نہ پہنچائے اور یک طرفہ طور پر خود دوسروں سے فائدہ لینا چاہے، اس کے لیے اِس دنیا میں صرف یہ انجام مقدر ہے کہ وہ کبھی کامیابی اور ترقی (success) حاصل نہ کر سکے۔

کھونے میں پانا

انڈیا میں سول سروس کے امتحانات میں سب سے بڑا امتحان آئی اے ایس (IAS) سمجھتا جاتا ہے۔ یہ وہی امتحان ہے جس کو 1947 سے پہلے آئی سی ایس (ICS) کہا جاتا تھا۔ 2010 میں پورے انڈیا سے چار لاکھ امیدوار اِس امتحان میں شریک ہوئے۔ مئی 2010 میں اِس کا رزلٹ شائع ہوا ہے۔ اِس کے مطابق، آئی اے ایس کے اِس امتحان میں کشمیر کے ایک مسلم نوجوان ڈاکٹر شاہ فیصل (26 سال) نے ٹاپ کا درجہ حاصل کیا ہے۔

اِس کہانی کا ایک سبق آموز پہلو یہ ہے کہ ڈاکٹر شاہ فیصل کے والد غلام رسول شاہ کپواڑہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ اسکول کے ایک ٹیچر تھے۔ ایک بار کچھ ملٹنٹ وہاں آئے اور ان کے گھر میں ٹھہرنے کی فرمائش کی۔ غلام رسول شاہ نے ان کو اپنے گھر میں ٹھہرانے سے انکار کر دیا۔ اِس پر ملٹنٹ غصہ ہو گئے اور انھوں نے غلام رسول شاہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

اِس کے بعد حالات کے دباؤ کے تحت ڈاکٹر شاہ فیصل کی فیملی گاؤں چھوڑ کر سری نگر آ گئی۔ یہاں ان کے لیے، ان کی ماں کے الفاظ میں، ایک ہی آپشن تھا، اور وہ تھا سخت محنت اور یکسوئی (hard work and dedication)۔ شاہ فیصل کے باپ کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا، اُس نے ان کو عمل کا ایک نیا محرک (incentive) دے دیا۔ وہ زیادہ سنجیدہ اور زیادہ محنتی بن گئے۔ باپ کی ناگہانی موت نے اُن کو ایک نئی زندگی دے دی۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (7 مئی 2010) کے رپورٹر نے درست طور پر لکھا ہے کہ — یہ دراصل ایک المیہ تھا جس نے شاہ فیصل کے خاندان کے لیے وسیع تر دنیا کی طرف ایک کھڑکی کھول دی:

It was the tragedy that opened a window
to the wider world for the family (p. 1)

آدمی اگر مایوس نہ ہو تو ہر محرومی اس کے لیے ایک نئی یافت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

صحیح مشورہ، غلط مشورہ

افراد کی زندگی میں اور قوموں کی زندگی میں بار بار ایسے معاملات پیش آتے ہیں جن کے مقابلے میں ایک سے زیادہ روش کو اختیار کرنا ممکن ہوتا ہے۔ مثلاً کسی نزاع (controversy) کے موقع پر یہ فیصلہ لینا کہ اس کے مقابلے کے لیے پُرامن طریقِ کار اختیار کیا جائے یا پرتشدد طریقِ کار، معاملہ کو یک طرفہ بنیاد پر ختم کردیا جائے، یا اس کو دوطرفہ بنیاد پر ختم کیا جائے، خاموشی اختیار کرلی جائے، یا فعّال رول ادا کیا جائے، صبر کا طریقہ اختیار کیا جائے، یا ٹکراؤ کا طریقہ، معاملے کو ہر قیمت پر فوراً ختم کردیا جائے یا اس کے مقابلے میں کوئی لمبی کارروائی کی جائے، وغیرہ۔

ہر ایسے موقع پر دو قسم کے مشیر (advisors) سامنے آتے ہیں— صحیح مشورہ دینے والے اور غلط مشورہ دینے والے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ صاحبِ معاملہ شخص اکثر غلط مشورے کو لے لیتا ہے اور صحیح مشورے کو چھوڑ دیتا ہے۔ اِس کی مثالیں ماضی میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں اور حال میں بھی۔ سوال یہ ہے کہ کیوں ایسا ہے کہ انسان اپنے معاملات میں صحیح مشورے کو قبول نہیں کر پاتا، وہ اکثر غلط مشورے کو مان لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ بعد کو نقصان کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو آدمی کے اوپر جذبات غالب آجاتے ہیں، وہ خالص عقلی (rational) انداز میں نہیں سوچ پاتا۔ اِس بنا پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اُس وقت صحیح مشورے کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتا، وہ جذبات کے زیر اثر، غلط مشورے کو لے لیتا ہے، اگرچہ بعد کو اس کا نتیجہ مزید نقصان کی صورت میں بھگتنا پڑے۔ جب بھی کسی کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آئے تو وہ اپنے متاثر ذہن کی بنا پر اُس کے بارے میں صحیح رائے نہیں قائم کر پاتا۔ مگر جو شخص معاملے سے الگ ہے، وہ اِس پوزیشن میں ہوتا ہے کہ وہ غیر جانب دارانہ انداز میں سوچے اور صحیح رائے دے سکے۔ ایسی حالت میں صاحبِ معاملہ کو چاہیے کہ دوسرا شخص اگر سنجیدہ ہے تو وہ اُس کی رائے پر دھیان دے اور اگر بے لاگ جائزے میں اس کی رائے درست نظر آئے تو وہ اس کو قبول کرلے۔

ایک عام کمزوری

ایک عوامی مثل ہے— عقل بڑی کہ بھینس۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ گاؤں میں رہنے والا ایک جاہل آدمی جب بھینس کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو ایک بھاری بھرکم چیز نظر آتی ہے۔ وہ بھینس کو بڑی چیز سمجھ لیتا ہے۔ عقل (wisdom) کی اہمیت اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ظاہری علم کی بنا پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ بھینس ایک بڑی چیز ہے۔ اِس کے مقابلے میں عقل محض ایک چھوٹی چیز۔

یہ محض گاؤں کے ایک جاہل آدمی کی بات نہیں، یہی شہروں میں رہنے والے تعلیم یافتہ لوگوں کی بات بھی ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ سیاسی اقتدار کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی بلڈنگوں میں قائم ہونے والے ادارے کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ جس اجتماع میں عوام کی بھیڑ اکھٹا ہو جائے، اس کو وہ بڑا اجتماع سمجھتے ہیں۔ جس آدمی کے پاس شان دار مکان ہو اور اس کے گیٹ کے باہر کاریں کھڑی ہوئی ہوں، وہ اس کو بڑا آدمی سمجھ لیتے ہیں۔ جو اخبار میں چھپے اور ٹی وی میں نظر آئے، اس کو وہ بڑی شخصیات (celebrities) میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ جو آدمی اسٹیج پر پُر جوش خطابت کرے اور جس کو سن کر سامعین تالیاں بجائیں، اس کو لوگ بڑا مقرر سمجھ لیتے ہیں۔ جو آدمی سڑک پر چلے تو اس کے پیچھے گاڑیوں کا کارواں (motorcade) چل رہا ہو، اس کو وہ معزز انسان سمجھ لیتے ہیں، وغیرہ۔

یہ ایک عمومی کمزوری ہے۔ یہی کمزوری کسی بڑے کام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی بڑا کام ہمیشہ چھوٹے آغاز (humble beginning) سے شروع ہوتا ہے۔ جو لوگ چھوٹے آغاز کی اہمیت کو نہ جانیں، ان کے درمیان کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔

بڑے کام کے لیے ہمیشہ لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جب چھوٹے آغاز کے لیے لوگ اپنا تعاون (co-operation) نہ دیں تو اُن کے درمیان بڑے کام کا آغاز ہی نہیں ہو سکتا۔ اِس قسم کا مزاج کسی بڑے کام کے لیے ایک مستقل رکاوٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

سوال و جواب

سوال

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ لیکن روایات میں آتا ہے کہ بعد کے زمانے میں امت کے اندر وہی بگاڑ پیدا ہو جائے گا جو پچھلے اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے اندر پیدا ہوا تھا۔ سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے تو پھر ایسا کس طرح ممکن ہے کہ امت کے اندر وہی بگاڑ پیدا ہو جائے جو سابق اہلِ کتاب کے اندر پیدا ہوا تھا (حافظ ابوالحکم محمد دانیال، پٹنہ، بہار)

جواب

یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے (15: 9)، لیکن اِس حفاظت کا تعلق دینِ اسلام کی حفاظت سے ہے، نہ کہ مسلم قوم کی حفاظت سے (5: 3)۔ دینِ اسلام کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ دین کا متن (text) پوری طرح محفوظ رہے گا، تاکہ ہر زمانے میں ہدایت کا طالب اُس سے ہدایت پا سکے۔ لیکن جہاں تک مسلم قوم کا تعلق ہے، وہ اُسی طرح حالتِ امتحان میں ہے جس طرح دوسری قومیں حالتِ امتحان میں ہیں۔ اِس سلسلے میں جتنی بھی روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں، وہ سب صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ دین کا معاملہ اور قوم کا معاملہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہے۔ ختمِ نبوت کا تقاضا ہے کہ دین کا متن قیامت تک محفوظ رہے۔ مگر جہاں تک مسلم قوم کا معاملہ ہے، اُس کے لیے عروج و زوال (rise & fall) کا وہی عام قانون ہے جو دوسری اہلِ کتاب امتوں کے لیے ہمیشہ سے رہا ہے۔ اِس معاملے میں کسی قوم کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔

کچھ لوگوں نے غلط طور پر یہ نظریہ بنایا ہے کہ جس طرح دین ایک محفوظ دین ہے، اُسی طرح مسلم امت بھی ایک محفوظ امت ہے۔ مگر یہ ایک خود ساختہ نظریہ ہے، اِس کی کوئی اصل قرآن اور حدیث میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر امت کی محفوظیت کا نظریہ اِس روایت سے نکالا جاتا ہے کہ: **إنَّ أمتی لاتجتمع علی الضلالة** (ذخیرة الحفاظ للقیسرانی، 1/364) مگر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ امت کی اکثریت ضلالت سے محفوظ رہے گی۔ یہ حدیث افراد کی نسبت سے ہے، نہ کہ مجموعہ کی نسبت سے، یعنی امت کے عام

بگاڑ کے زمانے میں بھی کچھ ایسے افراد ہوں گے جو عمومی بگاڑ کے زمانے میں بھی ہدایت پر قائم رہیں گے۔ اِسی لیے ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **أن تستجمعوا كلُّكم على الضلالة** (**مسند إسحاق بن راهوَيه، رقم الحديث:** 363) یعنی بعد کے زمانے میں جب امت میں عام بگاڑ آجائے گا تو اُس وقت بھی کچھ افراد اِس عمومی بگاڑ سے محفوظ رہیں گے۔

سوال

عرض ہے کہ ہندستان کے مخصوص حالات میں مسلمانوں کو ان کی سیاسی زندگی میں قرآن اور حدیث سے کیا رہنمائی ملتی ہے براہِ کرم، واضح فرمائیں۔ (محمد یحییٰ ارسلانی قاسمی، پالم کالونی، نئی دہلی)

جواب

اس معاملے میں قرآن اور حدیث کی رہنمائی یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ہندستان کے مسلمان بلکہ ساری دنیا کے مسلمان سیاست کو مکمل طور پر چھوڑ دیں اور وہ صرف غیر سیاسی دائرے میں کام کریں۔ مثلاً تعلیم، دعوت، تجارت اور تعمیر، وغیرہ۔ کام کا تعین ہمیشہ حالات کے اعتبار سے ہوتا ہے، نہ کہ کسی مفروضہ معیار کے اعتبار سے۔ حالات کا لحاظ کئے بغیر کسی مفروضہ معیار کو لے کر جو کام شروع کیا جائے، وہ صرف بے نتیجہ ٹکراؤ پیدا کرے گا، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

موجودہ زمانے کے مسلمان ہر جگہ اپنے سیاسی ذہن کے تحت اپنی سرگرمیاں جاری کئے ہوئے ہیں۔ چوں کہ حالات موافق نہیں ہیں، اِس لیے اِن سیاسی سرگرمیوں کے نتیجے میں اُن کو جو چیز ملی ہے، وہ صرف یہ ہے — شکایت، احتجاج، نفرت، منفی سوچ اور تشدد، وغیرہ۔ اِس طرح کی تمام چیزیں صرف یک طرفہ طور پر مسلمانوں کے نقصان کا باعث ہیں، وہ اُن کو کوئی مثبت نتیجہ دینے والی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قدیم مکہ میں سیاسی اقتدار کی پیش کش کی گئی۔ مکہ کے معاصر سرداروں نے آپ سے کہا: **إن تريد مُلكاً، ملّكناك علينا** (اگر آپ اقتدار چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اقتدار دینے کے لیے تیار ہیں) آپ نے اِس سیاسی پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا: **ما أطلب الملك عليكم** (**السيرة النبوية لابن هشام،** 1/296) یعنی میں

تمھارے اوپر اقتدار کا طالب نہیں: I seek not sovereignty over you.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت کے مکی حالات کے اعتبار سے یہ فیصلہ کیا۔ آج کل کی زبان میں کہا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ آپ نے سیاسی عمل (political activism) کے بجائے دعوتی عمل (dawah activism) کا طریقہ اختیار فرمایا۔ اس اعتبار سے، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ — آپ نے نتیجے کو سامنے رکھ کر اپنا منصوبہ بنایا، نہ کہ مفروضہ معیار کو سامنے رکھ کر۔

اِس معاملے میں دوسری مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی ہے۔ اگر مسلمانوں کا یہ خیال ہو کہ اُن کے لیے موجودہ حالات میں سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے، کیوں کہ یہ جمہوری دور ہے اور جمہوری دور میں اگر کوئی گروہ ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں شامل نہ ہو تو وہ پولٹکل ایلینیشن (political alienation) میں مبتلا ہو جائے گا، یعنی ایسا گروہ سیاسی اعتبار سے الگ تھلگ ہو کر رہ جائے گا۔ اِس دوسری حالت میں اُن کے لیے سنتِ یوسفی کا نمونہ موجود ہے۔ سنتِ یوسفی جیل میں جانے کا نام نہیں ہے، بلکہ سنتِ یوسفی دراصل سیاسی مصالحت (political adjustment) کا نام ہے۔ قرآن کے مطابق، حضرت یوسف کے زمانے میں مصر کا بادشاہ مشرک تھا۔ وہ شراب پیتا تھا۔ ملک میں اِسی مشرک بادشاہ کا قانون نافذ تھا۔ اِس کے باوجود حضرت یوسف نے مصالحت کا انداز اختیار کرتے ہوئے بادشاہ کے سیاسی نظام میں شرکت قبول کر لی۔ سیاست کا یہ طریقہ موجودہ زمانے میں ہر مسلمان کے لیے کھلا ہوا ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ قرآن اور سنت میں اُن کے لیے واضح سیاسی رہنمائی موجود نہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ اپنے فخر پسندانہ مزاج کی بنا پر سیاسی سرکشی کو سیاست سمجھتے ہیں، اور چوں کہ کسی ملک میں ان کے لیے سیاسی سرکشی کے مواقع حاصل نہیں، اِس لیے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن اور سنت میں ان کے لیے سیاسی رہنمائی موجود نہیں۔ اِس معاملے میں اصل مسئلہ مسلمانوں کے خود ساختہ سیاسی شاکلہ (political framework) کو توڑنا ہے۔ موجودہ سیاسی شاکلہ کی موجودگی میں قرآن اور سنت کی رہنمائی مسلمانوں کی سمجھ میں آنے والی نہیں۔

خبر نامہ اسلامی مرکز — 209

1- نئی دہلی میں 14-3 اکتوبر 2010 کے درمیان کامن ویلتھ گیم (CWG-2010) کا انعقاد ہوا۔ گیم کے دوران بڑے پیمانے پر کھلاڑیوں اور شرکا کو سی پی ایس کی طرف سے قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ ہمارے ساتھی جو کھیل گاؤں (نئی دہلی) میں دعوتی لٹریچر لے کر گئے تھے، ان میں سے ایک ساتھی نے اس سلسلے میں سی پی ایس کے ایک ممبر سے ان الفاظ میں اپنا تاثر بیان کیا:

Glory be to God, all the things are turning out very well beyond imagination and the distribution is in full swing.

2- نئی دہلی کے اسلامک کلچرل سنٹر میں اردو پریس کلب (نئی دہلی) کی طرف سے 15 اکتوبر 2010 کو ایک سیمنار ہوا۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوئے۔ اس کا عنوان یہ تھا — نیشنل ازم کو کیسے فروغ دیا جائے:

How to Promote Nationalism

اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس سیمنار (seminar) میں شرکت کی اور موضوع پر 15 منٹ کی ایک تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ حبّ وطن انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس معاملے میں مسلمانوں کے اندر نیا ذہن نوآبادیاتی دور میں پان اسلام ازم (Pan-Islamism) کی تحریک کے تحت پیدا ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قومیت کا تعلق مذہب سے ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی (وفات: 1957) نے اس نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے کہا تھا کہ — فی زمانہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں:

In present age, nationhood is based on homeland.

مگر اس بیان سے مسلمانوں کا ذہن بدل نہ سکا، کیوں کہ مسلم علماء نے یہ کہہ دیا کہ مولانا مدنی نے جو کچھ کہا، وہ انشا نہ تھی، بلکہ خبر تھی۔ ضرورت ہے کہ اس معاملے میں مسلمانوں کے ذہن کی اصلاح کی جائے، ورنہ مسلمان ہر ملک میں غیر وفادار بن کر رہ جائیں گے۔

3- الرسالہ مشن سے وابستہ ایک ساتھی نے امام حرم مکی شیخ عبد الرحمٰن السدیس سے ایک خصوصی پروگرام کے دوران مکہ میں ان کے گھر پر ملاقات کی۔ ملاقات کے وقت انھوں نے دیکھا کہ امام حرم کے مطالعے کی میز پر صدر اسلامی مرکز کی کتاب **الإسلام يتحدى** رکھی ہوئی ہے۔ ہمارے ساتھی نے امام صاحب سے پوچھا کہ آپ شیخ وحید الدین کو جانتے ہیں۔ امام حرم نے کہا کہ شیخ وحید الدین دورِ جدید کے عظیم داعی اور مفکر ہیں، ان سے کون ناواقف ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دعوتِ اسلامی کے احیاء اور اسلام اور دورِ جدید کی نسبت سے شیخ وحید الدین نے جو کام کیا ہے، وہ بلاشبہہ ایک تجدیدی کام ہے۔ ہمارے ساتھی نے ان کو بتایا کہ شیخ وحید الدین کی تفسیر کا عربی ایڈیشن مصر سے شائع ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں تذکیر القرآن (عربی) کا ایک سیٹ امام حرم کو صدر اسلامی مرکز کی طرف سے حسب ذیل خط کے ساتھ (22 اکتوبر 2010) کو دستی طور پر روانہ کیا گیا:

إلى فضيلة الشيخ د/عبد الرحمن السديس حفظه الله السلام عليكم ورحمة اللّٰه وبركاته

فيطيب لي أن أرفق طيه نسخة من "التذكير القويم في تفسير القرآن الحكيم" (3 مجلدات) وهو أهم وأضخم ما نقل إلى العربية من مؤلفاتي أخيراً. وقد قام بترجمته من لغة الأردو الأخ أبوصالح أنيس لقمان الندوي وتولى تقديمه ونشره الأستاذ د/عبد الحليم عويس من دار الوفاء القاهرية منذ حوالي سنة ونصف.

وإذا كان كتابي "الإسلام يتحدى" موجهاً إلى العقل المعاصر عامة لإثبات أحقية مبادئ الإسلام وخلود رسالته في مواجهة تيارات الفكر العلماني الحديث؛ فإنني حاولت من خلال تفسيري المتواضع هذا أن أذكّر المسلمين خاصة وهم أمناء على كتاب اللّٰه برسالتهم ومسؤوليتهم تجاهه. ومن ثم يدور هذا التفسير حول نقطةٍ مركزية هي "الدعوة" والتي تجدونها مناسبة في كل سطر من سطوره. فالقرآن الكريم هو كتاب "الدعوة إلى الله" أولاً وأخيراً. والامة الإسلامية هي قبل كل شيئ وبعد كل شيئ "أمة دعوة" وبالتالي عليها أن تلتمس كل الطرق الحكيمة والسلمية المتاحة وكل الأساليب المعاصرة والفعالة لأجل تبليغ دعوة القرآن إلى البشرية جمعاء.

وإنني إذ أهدي هذا الكتاب إلى فضيلتكم؛ راجياً أن يحظى بحسن القبول عندكم؛ أسأل اللّٰه تعالى أن يوفقنا جميعاً إلى السعي الحثيث الجاد لإدخال كلمته إلى كل بيت "مدر أو وبر"؛ كما ورد في حديث مسند الإمام أحمد. (أخوكم في الله وحيد الدين خان)

4- حکومتِ شارجہ (عرب امارات) کی جانب سے شارجہ ایکسپوسنٹر میں 26 اکتوبر تا 6 نومبر 2010 کے درمیان ایک انٹرنیشنل بک فیر منعقد ہوا۔ اس کا افتتاح شارجہ کے حکمراں دکتور السلطان بن محمد علی القاسمی (71 سال) نے کیا۔ اِس بک فیر میں نئی دہلی کے گڈ ورڈ بکس نے حصہ لیا۔ اسٹال پر بڑی تعداد میں لوگ آئے۔ انھوں نے خاص طور پر، صدر اسلامی مرکز کے انگریزی ترجمہ قرآن اور پرافٹ آف پیس کو بے حد پسند کیا اور اس کو شوق سے خریدا۔

5- یکم نومبر 2010 کو مولانا مکرم حسین قاسمی اور مولانا محمد ذکوان ندوی نے لکھنؤ کے ایک عقدِ نکاح میں شرکت کی۔ یہاں انھوں نے لوگوں کو ماہ نامہ الرسالہ اور دعوتی لٹریچر برائے مطالعہ دیا۔ اس موقع پر بہرائچ (یوپی) کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کو قرآن کا ہندی اور انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ جیوتی وسترالے کے مالک مسٹر شرما نے قرآن کو دیکھ کر اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ — لمبے عرصے سے میں قرآن کو پڑھنا چاہتا تھا، مگر اب تک میں اس کو حاصل نہ کر سکا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اب میں ضرور قرآن کو پڑھوں گا۔

6- دور درشن (نئی دہلی) کے اردو ٹی وی چینل کی ٹیم نے 10 نومبر 2010 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی

انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویو حج اور قربانی کے موضوع پر تھا۔ سوالات کے دوران موضوع کی وضاحت کی گئی۔

7- نظام الدین ویسٹ (نئی دہلی) کے کمیونٹی سنٹر میں 14 نومبر 2010 کو ایک پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام کمیونٹی کی طرف سے صدر اسلامی مرکز کو ایک اعزازی ایوارڈ دینے کے لیے کیا گیا تھا۔ اِس موقع پر بڑی تعداد میں ہندو اور مسلم افراد موجود تھے۔ ان لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

8- وائی ایم سی اے (Young Men's Christian Association) کی طرف سے 17 نومبر 2010 کو اس کے کیمپس گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک سیمنار ہوا۔ یہ سیمنار حقوق اطفال (child rights) کے موضوع پر تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اسلام کی روشنی میں موضوع پر انگریزی زبان میں آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ اِس موقع پر حاضرین کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔

9- خان مارکیٹ (نئی دہلی) میں 22 نومبر 2010 کو ہمارے ساتھیوں نے وہاں جا کر لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا۔ لوگوں نے اس کو بے حد شوق سے لیا۔

10- نئی دہلی کے سینٹ ایگنلس فادر اسکول (St. Agnel's Father School) میں 23 نومبر 2010 کو ایک پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام کیرلا کے اسوسی ایشین آف کرسچن فلاسفرس آف انڈیا (ACPI) کی طرف سے شائع کردہ انسائکلو پیڈیا آف فلاسفی (دو جلدیں) کے افتتاح کے موقع پر کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور انگریزی زبان میں علم کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ پروگرام کے صدر سپریم کورٹ کے جسٹس مارکنڈے کاٹجو (Makandey Katju) تھے۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

Maulana Wahiduddin Khan is a role model for India.

اِس پروگرام میں انڈیا کے مختلف کرسچن اسکولوں کے پرنسپل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو اور مسیحی افراد شریک تھے۔ ان لوگوں کو پرافٹ آف پیس اور قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔

11- سی پی ایس کے کچھ لوگ 24 نومبر 2010 کو نئی دہلی کے لال قلعہ گئے۔ اِس موقع پر انھوں نے وہاں کے زائرین (visitors) کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا۔

12- روڑکی (اتراکھنڈ) کے آئی آئی ٹی کالج میں 28 نومبر 2010 کو مسٹر ساجد انور نے سی پی ایس کی طرف سے صدر اسلامی مرکز کے دعوتی لٹریچر کے لیے ایک بک کارنر (Book Corner) قائم کیا۔ انھوں نے یہاں کے طلبا اور اساتذہ کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا۔

13- سہارن پور سی پی ایس برانچ نے 28 نومبر 2010 کو ایک دعوتی پروگرام کیا۔ اِس میں بطور چیف گیسٹ سوامی چنمیہ آنند (صدر، وویکانند ٹرسٹ، گروکل، ہری دوار) کو بلایا گیا تھا۔ اِس پروگرام کا موضوع امن اور اسلام تھا۔ اِس پروگرام میں اعلیٰ تعلیم یافتہ غیر مسلم حضرات نے شرکت کی۔ ان لوگوں کو قرآن کا ہندی اور انگریزی ترجمہ اور دعوتی

لٹریچر دیا گیا۔ سوامی پریم وکرم نے اپنے لوگوں کو بطور خود قرآن کا ترجمہ دیا۔ اِس موقع پر سوامی اگنی ویش نے صدر اسلامی مرکز کی تفسیر تذکیر القرآن کا ہندی ترجمہ حاصل کیا۔

14- نئی دہلی کے سائی انٹرنیشنل سنٹر (لودھی روڈ) میں 29 نومبر 2010 کو اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ تقریر کا موضوع یہ تھا:

Basic Human Values in Islam

صدر اسلامی مرکز نے انگریزی زبان میں موضوع پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ اِس پروگرام میں انڈیا کے مختلف اسکولوں کے پرنسپل نے شرکت کی۔ یہاں لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔

15- پستک میلہ سمیتی (نئی دہلی) کی جانب سے جھارکھنڈ کی راجدھانی رانچی کے تاریخی گراؤنڈ جے پال سنگھ اسٹیڈیم میں 3 دسمبر سے 12 دسمبر 2010 کے درمیان ایک نیشنل بک فیر منعقد ہوا۔ اِس بک فیر میں نئی دہلی سے گڈ وڈ بکس نے حصہ لیا۔ بڑی تعداد میں وزٹرس اسٹال پر آئے۔ بک اسٹال کا انتظام شاہ عمران حسن نے سنبھالا۔

16- نئی دہلی کے بھائی ویر سنگھ ساہتیہ سدن (گول مارکیٹ) کے ہال میں 8 دسمبر 2010 کو ایک سیمنار ہوا۔ یہ سیمنار گورنمنٹ آف انڈیا کے ڈپارٹمنٹ آف کلچر کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اِس کا موضوع یہ تھا:

International Seminar on Guru Granth Sahab.

اِس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اِس میں شرکت کی اور انگریزی زبان میں اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ اِس سیمنار میں سِکھ کمیونٹی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ سی پی ایس کی طرف سے ان لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

17- کشمیر کے انگریزی میگزین (Kashmir Scan) کی نمائندہ مزسماء ثابت نے 16 دسمبر 2010 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویو کا موضوع صدر اسلامی مرکز کی زندگی اور اُن کا مشن تھا۔ سوالات کے دوران تفصیل سے دونوں پہلوؤں کے بارے میں بتایا گیا۔

18- ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) میں مسلسل صدر اسلامی مرکز کے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں قارئین کے تاثرات سی پی ایس کو موصول ہوتے ہیں۔ یہاں اُن میں سے دو تاثرات نقل کئے جاتے ہیں:

I have gone through the 'Speaking Tree' column of Times of India with the caption 'Big Birds of the Storm' (TOI, Dec. 23, 2010) Your abilityto present the cardinal truths in simple language is commendable. I specially appreciate your efferots to enlighten the common man with such great rich spiritual practices which would enhance universal brother-hood and eternal peace in the world. Please accept my sincerest gratitude for the superior job you are doing in the interest of mankind. (Naresh Garg, Managing Trustee, Delhi)

- Thank you very much for such a beautiful article! Today what I learned from this article was very inspiring for me.Many people tried to explain me how to maintain calmness, but I could not maintain, and this article ('Big Birds of the Storm) did such a work that none ever did anytime! This article was really very good and very inspiring, I will really forward this article (Big Birds of the Storm) to schools and colleges. (Sagar Agarwal, Delhi)

19- قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر بڑے پیمانے پر غیر مسلموں کے درمیان پھیلایا جارہا ہے۔ لوگ خوشی کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں اُن میں سے چند تاثرات نقل کئے جاتے ہیں:

- I feel so indebted for the great gift I have been waiting, The Quran I just received today at midday, may God bless you abundantly and your team for this great mission, I was not able to read Quran as many I came across were in either Arabic or Roman but now I can read on my own. I am so happy. (Hillary Olola, Homabay, Nairobi, Kenya)

- I have a great regard for the religion of Islam and particularly, for Maulana Wahiduddin Khan, who interprets the Holy Quran, the Sahih Hadith & the life of the Prophet Muhammad in the most simple and practical manner. (Srinivasan Balakrishnan, Jamshedpur, Jharkhand)

- I truly believe that Maulana Wahiduddin Khan's understanding of Islam is wonderful and truly beneficial, he is one of the reasons that I have fell in love with Islam all over again. He will most definitely be one of the scholars I continue to read, and if his methodology was firmly promoted all over the world, I believe that many of those Muslims with ideological political agendas can come to see the truth of Islam and Prophet Message, insha Allah. I love Maulana Wahiduddin Khan's understanding of the ahl-Kitab and the respect he shows for other religions. May Allah continue to bless Maulana Wahiduddin Khan and I look forward to becoming a student of his teachings and methodologies. Maulana Wahiduddin Khan's understanding of true Islam is what the world needs! (Mike Westerfield, Panama, Florida, USA)

- Maulana Wahiduddin Khan is one of the Islamic scholars that caused Islam to be presented in the modern era. The sole reason behind this is that he presented Islam in a logical and scholarly way. (Muhammad Bilal, Pakistan)

20- سی پی ایس کی طرف سے مختلف لائبریریوں کو اسلامی کتابیں بھیجی جارہی ہیں۔ لوگ اس کو پسندیدگی کے ساتھ قبول کرکے اپنی لائبریری میں جگہ دیتے ہیں۔ اِس سلسلے میں یہاں ایک خط نقل کیا جارہا ہے:

- Thank you very much for sending us a set of books from the Centre for Peace and Spirituality International, authored by Maulana Wahiduddin Khan. After the customary review by the Library Book Selection committee, it will be added to our library for utilization of our readers. It is indeed a pleasure to add such well-written books to our library. (Br. Vidyachitanya, Ramakrishna Mission Library, New Delhi)

21- سی پی ایس کی طرف سے معروف اجتماعی مقامات — ہوٹل، ہاسپٹل، ریلوے اسٹیشن، ائرپورٹ، وغیرہ پر قرآن کے اسٹینڈر رکھے جارہے ہیں۔ لوگ یہاں سے بخوشی قرآن کا انگریزی ترجمہ حاصل کرتے ہیں۔

22- القرآن انسٹی ٹیوٹ (امین آباد، لکھنؤ) کی طرف سے بڑے پیمانے پر صدر اسلامی مرکز کا انگریزی ترجمہ قرآن غیر مسلموں تک پہنچایا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ تمام معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

23- حلقہ الرسالہ (بمبئی) کے ساتھیوں نے نومبر 2010 میں ایک مخصوص دعوتی پروگرام بنایا ہے۔ یہ ممبئی کی فلم انڈسٹری میں کام کرنے والے اسٹارس (film stars) اور نمائندہ لوگوں سے دعوتی ملاقات کا پروگرام ہے۔ یہ لوگ فرداً فرداً انڈسٹری کے لوگوں سے مل کر ان کو دعوتی لٹریچر پہنچا رہے ہیں۔ انڈسٹری کے کئی اردو داں حضرات نے اپنے پتے پر ماہ نامہ الرسالہ بھی جاری کیا ہے۔ مثلاً مسٹر قادر خان، وغیرہ۔

24- نئی دہلی کے ٹی وی چینل زی سلام کے اسٹوڈیو میں 24 جولائی 2010 سے صدر اسلامی مرکز کے اسلامی پروگرام کی ریکارڈنگ ہورہی ہے۔ اس پروگرام کی اینکر مز شگفتہ یاسمین صاحبہ ہیں۔ دسمبر 2010 تک 35 مختلف اسلامی موضوعات پر صدر اسلامی مرکز کے پروگرام ریکارڈ ہوکر نشر ہوچکے ہیں۔ یہ پروگرام سوال وجواب کی شکل میں ہوتا ہے۔

25- عربی زبان کے مشہور مصری ادیب اور مصنف ڈاکٹر عبد الصبور شاہین (82 سال) کا 26 ستمبر 2010 کو قاہرہ میں انتقال ہوگیا۔ صدر اسلامی مرکز کی کتاب **الإسلام يتحدى** کا عربی ترجمہ اُنھیں کے براہِ راست تعاون سے تیار کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں کے حسب ذیل مضمون میں اِس معاملے کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے:

Dr. Abdussabour Shahin (1928-2010)

While hastily turning the pages of the Kuwaiti magazine Al-Mujtama‘ last week, a familiar face stopped me - it was the image of my and millions’ dear teacher Dr Abdussabour Shahin, but the news printed along the photograph was shocking: he died on 26 September 2010 and was buried in Cairo next day after the funeral prayer at his beloved ‘Amr Ibn Al-‘Aas mosque, Egypt’s first mosque built after the Islamic conquest. He had

delivered Friday sermons in this very mosque for years until stopped by the authorities. Dr Abdussabour was one of the greatest names in the contemporary Middle East - a teacher, philosopher and linguist. Author of over 70 books, some multi-volume, he was a familiar face on Arabic channels and in Islamic conferences. He was professor of linguistics in Cairo University's Darul Uloom College and taught in a number of Arabic universities on deputation. He was elected to the Majlis Shoura, the upper house of Egyptian parliament. But the exceptional honour he received was to be the Imam Jumu'ah of 'Amr ibn Al-'Aas mosque where great personalities, like Shaikh Muhammad Al-Ghazali, had traditionally delivered the Friday sermon attended by tens of thousands of people who used to travel to that mosque from various corners of Cairo and nearby Giza. He was a master of French language too and translated many books of the Algerian thinker Malek Bennabi as well as the epoch-making book of Abdullah Draz on morals in Islam. I consider him my real teacher in life. Although I studied in Darul Uloom, but he did not teach me there as he taught in the Arabic department while I was in the department of Islamic history. I had wanted to translated my father's book, *Ilm-e Jadeed ka challenge' (God Arises)* and asked the great 'alim Shaikh Abdullatif Draz who was a former Vice Chancellor of Al-Azhar and treated me like his son. His suggestion was to go to Dr Abdussabour Shahin as he was the best person for this job. He at once phoned Dr Shahin who, in turn, readily agreed. This was in the early days of 1968. Next, I went to see him with the translation of a few pages of the book. He did not like the translation but liked the content. His disapproval of my translation was repeated again and again and I used to tell him that next day I will bring a better translation. His pet reply was: 'No, it will be the same again'. Then he used to ask me to explain to him reading the original and he himself used to write those lines. Thus, we continued this onerous task for perhaps eight or nine months with barely a page or so completed in a day. I used to go to him every evening by trolley bus all the way from Abbasia to his flat on the Qasr al-'Aini Street - a distance of may be 45 minutes each way, spend two-three hours with him and then return to my hostel by around midnight. Thus the book was completed. He soon went to teach in Kuwait University and took the manuscript with him. Soon, the book was published in best possible way titled *Al-Islam Yatahadda* which made waves in the Arab world and still

continues to do four decades later. It helped thwart the secular and westernization onslaught and paved the way for Islamic revival in the Middle East. I soon left Cairo for Libya and from there moved to UK but kept in touch with my teacher who taught me what Arabic is. If I know any amount of Arabic writing, perhaps the best in the Subcontinent, the credit goes to him alone. He was very particular about words and expressions. He was a brave, fearless and highly eloquent Muslim thinker who did not shy away from expressing himself in most difficult situations. I last saw him last year in Makkah during the Dialogue Conference held by King Abdullah. He looked frail, yet attentive and loving as ever. He embraced me, saying "Habibi" - my dear… That was the last time I saw him. May Allah fill his grave with light and award him for his services to Islam and Muslims who will remember him for long. (by Dr. Zafarul Islam Khan, The Milli Gazette, New Delhi, 1-15 Novermber 2010, p. 16)

بعض اداروں اور افراد کے نام ماہ نامہ الرسالہ (اردو) صرف ایک سال کے لیے اعزازی طور پر زرِتعاون کے بغیر جاری کیا جاتا ہے۔ جو حضرات مسلسل طور پر الرسالہ کو پڑھنا چاہتے ہیں، وہ دفتر کو زرِتعاون کے ساتھ اپنا خریداری نمبر (US No.) یا اپنا مکمل پتہ بھیج کر دوبارہ اپنے پتے پر الرسالہ جاری فرما سکتے ہیں۔

جو حضرات القرآن مشن (Al-Quran Mission) میں شامل ہو کر ہمارا تعاون کرنا چاہتے ہیں، اُن سے گزارش ہے کہ وہ اِس سلسلے میں القرآن مشن کے دفتر سے رابطہ کر کے اپنا مکمل پتہ، ٹیلی فون نمبر اور ای میل روانہ کریں، نیز اس بات کو واضح کریں کہ آپ القرآن مشن میں شامل ہو کر کس طرح اس کے ساتھ اپنا تعاون فرمائیں گے:

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Email: info@alquranmission.org, Mobile: +91-9810558483, Fax: +91-11-45651771

ISLAM FOR KIDS by
Saniyasnain Khan
ETV Urdu
Every Sunday 11.30 am

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 25 فی صد ہے۔ 100 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 33 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

Rahnuma-e-Hayat by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Tuesday and Wednesday 10.30 pm
Saturday and Sunday 6.00 am

Islami Zindagi by
Maulana Wahiduddin Khan
Zee Salaam
Daily 11.30 am and 6.30 pm